اسلام کا مسئلہ

سُنّی اور شیعہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ

از

وصی اقبال

مکتبہ "اسلامی دور" گھیر سیف الدین خاں
رامپور ۲۴۴۹۰۱ یو۔پی

ACC No. 18070 Date 26/3/..
Section مناظرہ Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

اسلام کا مسئلہ

سُنّی اور شیعہ ایک ہی سکّہ کے دو رُخ

ACC No. 7756 Date
Section مناظرہ Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

وصی اقبال

مکتبہ "اسلامی دور" گھیر سیف الدین خاں
رامپور ۲۴۴۹۰۱ یوپی

(جملہ حقوق محفوظ)

پہلی بار ۳۰۰۰

سالِ اشاعت ۱۹۸۹ء

قیمت :- /12 روپے

مطبوعہ

بلس آفسیٹ پریس دھلی

ناشر

نوید اقبال

مکتبہ: "اسلامی دور" گھیر سیف الدین خاں رامپور ۲۴۴۹۰۱ یوپی

ACC No. 18070 Date 29/3/11
Section مناظرہ Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

بسم الله الرحمن الرحيم

مُصنّف ایک نظر میں

نام ـــــــ وصی محمد خاں

قلمی نام ـــــــ وصی اقبال

والد کا نام ـــــــ ہادی محمد خاں (مرحوم)

پیدائش ـــــــ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء رام پور (سابق ریاست) یو۔پی

شادی ـــــــ نومبر سنہ ۱۹۶۳ء

اولادیں ـــــــ چھ لڑکے، ایک لڑکی

تعلیم ـــــــ ایم۔اے۔ فاضل دینیات دیوبند، ادیب کامل علی گڑھ

تصنیفات وتالیفات :- "اسلامی نظام ایک نظر میں"، "نراشنس اور آخری رسولؐ"، گہر ہونے تک، انداز تو پہچانو، روشنی کا مینار، کعبہ مرے آگے، سفارش، آندھی میں چراغ، گرتی دیواریں، بہاریں لوٹ آئیں گی، حمیدا، جنّت کا شہزادہ، نیلا پیوند، بھٹو صاحب کی پریشانی، شہزادہ مُراد، اور میں مسلمان ہوگیا، وقت کی آواز۔ (زیر طبع) انسان یا شیطان، جنّت محل۔

مُعاشی مشغلہ ـــ کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ میں ملازمت۔

مُرتّبہ

نوید اقبال (علیگ)

ترتیب

پیش لفظ ۔ ۷

ابتدائیہ ۹

احتیاط کا تقاضا ۱۱

رسولِ اکرمؐ کی آگاہی ۱۲

ایک اچھی مثال ۱۳

اندھیرا چھٹ رہا ہے ۱۵

یہ اسلام کا مسئلہ ہے ۱۶

حدیث رسولؐ کی غلط تفہیم ۱۷

سُنّی اور شیعہ ۱۹

ایک ہی سکّہ کے دو رُخ

تاریخ کی گواہی ۲۱

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

شیعیت کیا ہے؟ ۲۵

منصبِ الٰہی ۲۷

ائمہ اثنا عشرہ ۲۸

اُصول دین ۳۱

توحید ۳۲

نبوت ۳۳

امامت ۳۴

عدل ۳۵

معاد ۳۸

نظامِ عمل ۴۷

نماز ۴۹

روزہ ۵۹

زکوٰۃ ۶۰

خمس ۶۰

حج ۶۱

جہاد ۶۲

مسئلہ امامت ۶۵

امامت کا مفہوم ۶۶

امامت کی ضرورت ۶۷

نبوت اور امامت ۵۰
عصمت امام ۵۱
ائمہ اثنا عشرہ کا ثبوت ۵۲

تحریف قرآن ۵۵
عظمت قرآن مجید ۵۷
قرآن مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ ۵۸
شیعہ مسلمان قطعاً تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ ۵۹
پہلی گواہی ۵۹
دوسری گواہی ۵۹
تیسری گواہی ۶۰
چوتھی گواہی ۶۰
موجودہ قرآن اور حضرت علیؓ ۶۱
قرآن معیار حق ہے ۶۲
حضرت علیؓ کے قرآن کی حقیقت ۶۴
آخری بات ۶۴

تقیہ ۶۷
تقیہ کے معنی ۶۹
تقیہ کرنا جائز ہے۔ ۷۰
ایک غلط فہمی کا ازالہ ۷۴
آخری بات ۷۶

مسئلہ بداء ۷۹
بداء کا مفہوم ۸۰
مخالفین اسلام کے چند عقائد ۸۲
اسلامی عقیدہ ۸۳
تکوین اور تشریع ۸۴
نسخ ۸۵
امور تکوینی میں تنسیخ ۸۶
عقیدہ بداء کیوں؟ ۸۷
عقدہ کشائی ۹۲

متعہ ۹۵
(عقدِ وقتِ مقررہ)
مولانا مودودیؒ کا موقف ۹۶
موقف میں تبدیلی ۹۷
آیتِ قرآن سے استدلال ۹۸
مزید شہادتیں ۱۰۰
احادیث رسولؐ سے جواز ۱۰۲
حضرت عمرؓ کا حکم ۱۰۳
مسئلہ کا واحد حل ۱۰۵
متعہ کیا ہے؟ ۱۰۶
خلاصۂ کلام ۱۰۸
خاتمۂ کلام ۱۱۰

پیش لفظ

آپ اُس سرسبز و شاداب تناور درخت کا تصوّر کیجیے جس کی جڑیں نہایت مضبوطی سے دور تک پھیلی ہوئی ہوں اور جس کی شاخوں نے چاروں طرف پھیل کر ایسا خوشگوار سایہ پیدا کر دیا ہو کہ بھٹکتے ہوئے مسافر اُس کے سایہ میں فرحت اور سکون کا احساس کر سکیں۔ اگر اُس درخت کی باہم مربوط شاخوں میں سے بعض کو کوئی کاٹ دے تو نہ پیڑ کا فطری حسن برقرار رہے گا اور نہ ہی اتنی افادیت باقی رہ جائے گی کہ جتنی پہلے تھی۔ درخت کی شاخوں کو کاٹنے کا عمل یقیناً اجتماعی مفاد میں نہیں بلکہ کاٹنے والا شخص یا گروہ کے انفرادی فائدے کے لیے ہوگا۔

اسلام بھی ایک سرسبز و شاداب تناور درخت ہے۔ اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ طلب حق میں بھٹکتے مسافر اس کے سایہ میں اطمینان و عافیت حاصل کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ اپنے ذاتی اور دنیاوی مفادات کی خاطر اسلام کے حسن اور عظمت کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن وہ اسلام دشمنوں کے آلہ کار ہیں اس لیے ان کے پاس وسائل ہیں اور وہ اپنی ان کوششوں میں کسی حد تک کامیاب رہتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ حقائق کو غلط انداز میں عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں اور نتیجہ میں فتنہ و فساد وجود میں آجاتا ہے اور مجموعی طور پر ساری ملّت کو اس سے نقصان پہنچتا ہے افتراق بین المسلمین کے یہ علمبردار ہر ملک میں ہیں اور ان سب کا ایک ہی مقصد ہے کہ عوام میں تفرقہ ڈال کر اپنی زندگیوں کو دوام بخشیں اور اپنے لیے دنیاوی آسائشیں حاصل کریں۔ اُمّتِ مسلمہ کے اس المیہ سے ہر ملک میں مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات بھی تقریباً یکساں ہی ہیں خواہ وہ ہندوستان ہو، پاکستان ہو، مصر ہو یا کوئی اور ملک۔

اختلافات کہاں نہیں ہوتے؟ افہام و تفہیم کے ذریعہ انھیں دور کیا جا سکتا ہے اور کیا بھی

جاتا ہے لیکن جب مذہب کے تعلق سے اختلافات پیدا کیے جاتے ہیں تو افہام و تفہیم کے سارے دروازے بند کر لیے جاتے ہیں اور پھر دوسرا فریق اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنا چاہے تو نہیں سنا جاتا۔ ایسے لوگ دنیا میں چاہے کچھ کر گزریں لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے یقیناً جواب دہ ہوں گے شیعہ اور سنّی اختلافات کے سلسلہ میں تو کم از کم یہی رویّہ رہا ہے۔ دونوں مسالک کے بعض علمار نے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ جہاں یہ ساری کوششیں ہوتی ہیں وہاں کچھ اللہ کے بندے مسلمانوں کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوششوں میں بھی لگے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک وصی اقبال صاحب بھی ہیں۔

وصی اقبال صاحب سنّی مسلمان ہیں۔ دین کی خدمت کا جذبہ اور ملّت کا درد رکھتے ہیں۔ موصوف کی ساری کوششیں اتحاد بین المسلمین کے لیے وقف ہیں وہ اپنی تحریروں اور تقریروں سے اُن غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کر رہے جن کی بنیاد بعض اصطلاحیں ہیں اور جن کی افتراق پسندوں نے من مانی تشریح کر کے اسلام کے درخت کی ایک شاخ کو کاٹنے کی کوشش کی ہے۔

وصی اقبال صاحب نے اس بار ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جو انتہائی اہم ہونے کے علاوہ بہت زیادہ حسّاس بھی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ علامہ مرتضیٰ مطہری شہید کے ایک قاری کی طرح اُن سے بھی کچھ کرم فرمایہ باز پرس کریں کہ انھوں نے شیعوں کے غلط عقائد اور مسلک کو درست ثابت کرنے کی کیوں کوشش کی ہے؟ اس کتاب کے مطالعہ سے پہلے میرا بھی اُن سے یہی سوال تھا جس کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

"اوّل تو میں نے اپنے طور پر کسی غلط بات کو درست اور صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنے ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر جو حقائق میرے سامنے آئے ہیں پہلے میں نے صاف ذہن کے ساتھ انھیں خود سمجھا اور اس کے بعد جوں کے توں وہ حقائق قارئین کے سامنے رکھ دیے ہیں تاکہ صدیوں کے اختلافات اور دوری نے اُمّتِ مسلمہ کے دو بڑے فرقوں کے درمیان نفرت و عداوت کے جو دبیز پردے حائل کر دیئے ہیں وہ ہٹ سکیں۔"

اللہ تعالیٰ موصوف کے اس جذبہ کو باعث اجر بنائے اور ان کی کوششوں کو بار آور کرے۔ آمین۔

مرتضیٰ حسین تسلیمی

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بہت دن ہوئے "لندن ٹائم" کے کسی سابق مدیر کا ایک واقعہ میرے مطالعہ میں آیا تھا۔ اور اس واقعہ کو میں نے اُردو میں منتقل بھی کیا تھا۔

یہ محترم مدیر روزنامہ لندن ٹائم کے مدیرِ اعلیٰ بننے سے پہلے بوٹ پالش کا کام کرتے تھے۔ ان محترم کو زبان و ادب کے عمومی مطالعہ کے سبب بہت سے ادبی اور معیاری الفاظ اپنی گفتگو میں استعمال کرنے کا سلیقہ آگیا تھا۔ اسی دوران محترم کی ملاقات ایک امریکی سرمایہ دار سے ہوگئی جو جو اکثر غیر ملکی سفر پر رہتا تھا اور مطالعہ کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتا تھا۔ اسی لیے اُس امریکی سرمایہ دار کے پاس دورانِ سفر بھی کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ رہتا تھا۔

امریکی سرمایہ دار نے جب پہلی ہی ملاقات میں ایک بوٹ پالش والے کی زبان سے لاطینی زبان کا ایک معیاری لفظ سنا تو وہ ششدر رہ گیا۔ پھر باہمی رضامندی کے تحت اُس نے بوٹ پالش والے کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اپنی کتابوں کے مطالعہ کی کھلی اجازت دے دی۔ امریکی سرمایہ دار کی مستقل صحبت اور معیاری کتب کے مسلسل مطالعہ نے نہ صرف اس کی زبان کو جِلا بخشی بلکہ اس کے اندر اعتماد بھی پیدا کیا۔

وہ ایک دن روزنامہ لندن ٹائم کے دفتر گیا۔ مدیرِ اعلیٰ سے ملاقات کی اور تبصرہ کے لیے ایک کتاب مانگی۔ مدیرِ اعلیٰ نے ایک عجیب ناگواری کے انداز سے اُس کی جانب دیکھا پھر اُس کی طرف ایک کتاب پھینکتے ہوئے کہا۔ اس پر لکھ کر لائیے۔

بوٹ پالش والے نے اپنے کمرہ پر آکر کتاب ایک طرف ڈال دی اور پھر کتاب کے مصنّف پر اب تک جو کچھ لکھا گیا تھا۔ اس کا اور خود مصنّف کی دوسری ساری کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس نے مجوزہ کتاب پر تبصرہ کیا۔

حق کی ادائیگی کے سلسلہ میں میں نے اس واقعہ کو دیانت داری کی ہمیشہ ایک اعلیٰ مثال تصوّر کیا ہے۔ اور اکثر سوچا ہے کہ جب ایک عام آدمی ایک کتاب اور اس کے لکھنے والے کے سلسلہ میں اظہار خیال سے پہلے اس قدر احتیاط برت سکتا ہے تو ہمارے مقتدر علماء کا معاملہ تو بہت آگے ہونا چاہیئے تھا۔ پھر یہاں معاملہ پسند اور ناپسند کا ہے۔ اور معزز علماء کے اظہار کے نتیجے میں بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

احتیاط کا تقاضا

لیکن اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ خاصے معقول اور صاحب علم حضرات بھی حدِ اعتدال سے گر کر انتہا پسندی کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اُن نظائر کو بھی پسِ پشت ڈالتے ہیں۔ جو ہمارے لیے ہمیشہ سے ایک عظیم سرمایہ رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر یوسف القرضاوی اپنی تالیف "اسلامی بیداری انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"خلفاء راشدین کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تو وہ اس وسیع علم و فضل کے باوجود جس سے اللہ نے ان بزرگوں کو نوازا تھا۔ صحابہؓ اور علماء صحابہؓ کو جمع کرتے ان سے مشورہ کرتے، ان کی رایوں سے روشنی حاصل کرتے، اسی قسم کے اجتماعی فتوؤں سے قرن اوّل میں اجماع کی نشوونما ہوئی۔"

ڈاکٹر موصوف آگے لکھتے ہیں۔

ان بزرگوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو فتویٰ دینے سے توقف فرماتے، خود جواب دینے کے بجائے دوسروں کے حوالے کر دیتے یا کہتے میں نہیں جانتا۔ حضرت عقبہ بن مسلمؓ کا ارشاد ہے کہ میں چوتیس ماہ تک ابن عمرؓ کے ساتھ رہا۔ بیشتر مسائل میں جو ان سے معلوم کیے جاتے۔ وہ جواب دیتے۔ "میں نہیں جانتا"

ابن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے ایک سو بیس ۱۲۰ انصار صحابہؓ سے ملنے کا مجھے شرف حاصل ہے۔ ان میں سے جب کسی سے کوئی مسئلہ معلوم کیا جاتا تو وہ دوسرے کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہتا۔ دوسرا کسی اور کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہتا

یہاں تک کہ مسئلہ گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتا۔ جہاں سب سے اوّل معلوم کیا گیا تھا۔ ان حضرات میں سے جب کسی سے مسئلہ معلوم کیا جاتا تھا تو اُس کی تمنّا یہی ہوتی تھی کہ کاش اس کا کوئی بھائی یہ بارِ گراں اُٹھا لیتا۔

حضرات صحابہؓ کے بعد تابعینؒ اور تابعینؒ کے بعد ائمہ کرام کا بھی یہی طریقہ کار رہا۔ چنانچہ ابن مہدیؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ کو یہ کہتے سنا ہے کہ بسا اوقات میرے سامنے ایک مسئلہ پیش کیا جاتا ہے اور میں اسی مسئلہ پر غور و فکر کرتے ہوئے پوری رات گزار دیتا ہوں۔

عام دینی مسائل کے بارے میں ہمارے اکابرین نے یہ احتیاط برتی ہے۔ کسی مسلمان کی تکفیر کا معاملہ تو اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اسی کی بنیاد پر اُس کی جان اور اُس کا مال حلال ہو جاتا ہے۔ اُس کی بیوی اور بچے اُس سے جدا ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ جب وہ مر جائے گا تو اُسے غسل اور کفن بھی نہیں دیا جائے گا۔ نہ اُس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہو گا۔

رسولِ اکرمؐ کی آگاہی

اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان پر کفر کی تہمت لگانے سے بڑی شدّت کے ساتھ خبردار کیا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جس نے اپنے مسلمان بھائی کو اے کافر کہہ کر پکارا تو یہ تہمت دونوں میں سے کسی ایک پر لوٹ آئے گی۔ جس کو کافر کہا گیا ہے اگر واقعی وہ کافر نہیں ہے تو یہ تہمت کہنے والے پر لوٹ آئے گی اور اُس پر چسپاں ہو کر رہ جائے گی۔

سوچیے، یہ کتنی خطرناک بات ہے؟

بعض لوگ جوابی کارروائی کے طور پر اپنے مخالفوں کے لیے تکفیر کا حکم لگاتے ہیں اور جیسا کہ محترم ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے تحریر کیا ہے کہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ "جس نے مسلمان کی تکفیر کی اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔" لیکن یہ صحیح بات نہیں ہے وہ کہتے ہیں۔ اس حدیث کا اطلاق اس پر نہیں ہوتا جو کسی کی تکفیر کسی تاویل یا شبہ کی بنیاد پر کرتا ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث اور ان ثابت شدہ واقعات سے ہوتا ہے جن کا تعلق صحابہ کرامؓ سے ہے۔

چنانچہ اس تعلق سے حضرت علیؓ کا طرزِ عمل ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ خوارج حضرت علیؓ سے برسرِ جنگ تھے اور ایک عام مسلمان پر جو بدترین تہمتیں لگائی جا سکتی ہیں۔ خوارج نے وہ تہمتیں حضرت علیؓ پر، مسلمانوں کے سردار پر، اسلام کے شہہ سوار پر، فاطمہؓ کے شوہر پر، رسول اللہ کے چچازاد بھائی پر اور اللہ کی تلوار پر لگائیں۔ لیکن اس سب کے باوجود حضرت علیؓ نے انکے باطل کی ضرور تردید کی مگر ان کی تہمتوں کے جواب میں تہمت تراشی نہیں کی۔ خوارج نے حضرت علیؓ کی تکفیر کی لیکن آپؓ نے اُن کی تکفیر نہیں کی۔ بلکہ حسن خلق سے کام لے کر انھیں دائرہ اسلام میں باقی رکھا۔

آیئے، اس معاملہ پر ایک دوسرے رخ سے بھی غور کریں۔ آج ہم نے اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو پس پشت ڈال کر۔ "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو" اپنے آپ کو فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ ہاں یہ فرقہ بندی اور گروہ بندی صرف اپنی شناخت کے لیے ہوتی تو بھی کسی حد تک غنیمت تھا۔ لیکن یہ معاملہ صرف شناخت اور پہچان نہیں ہے۔ بلکہ تفوّق اور برتری کا معاملہ بن گیا ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے فرقوں اور گروہوں کی تذلیل اور تکذیب بھی لازمی ہے۔ لہٰذا ہر فرقہ اور گروہ اپنے سوا سب کو گمراہ یا کافر سمجھتا ہے۔ اس طرح۔ میں نے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے اجتماع کو ایک مرتبہ خطاب کرتے ہوئے عرض کیا تھا۔ ہاں اس طرح جب ہر فرقہ اور گروہ دوسرے سارے فرقوں اور گروہوں کو گمراہ یا کافر کہے گا تو بہت تسلی اور اطمینان کے ساتھ حساب لگا کر بتایئے کہ اب مسلمان کون رہا۔

ایک اچھی مثال

لیکن ایسا نہیں ہے، جس نے اس بات کی شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندہ اور رسول ہیں۔ قرآن پاک کو اللہ کی کتاب جانا۔ آخرت کو برحق سمجھا۔ فرشتے اور اچھی بری تقدیر ہونے پر یقین کیا۔ وہ مسلمان ہے اور جب تک وہ ان حقیقتوں کو تسلیم کرتا رہے گا وہ مسلمان رہے گا۔ کوئی اُسے لاکھ گمراہ یا کافر کہتا رہے۔

اس سلسلہ میں حضرت اُسامہ بن زیدؓ کا واقعہ ہمارے لیے ایک اچھی مثال ہے حضرت اُسامہؓ نے لا الہ الا اللہ کہنے کے باوجود میدان جنگ میں ایک شخص کو قتل کر دیا۔ اس پر حضور اکرمؐ نے

بڑی شدت کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ لاالٰہ الااللہ کہنے کے بعد تم نے اُسے قتل کر دیا؟ حضرت اسامہؓ نے کہا۔ اس نے صرف تلوار کے خوف سے لاالٰہ الا اللہ کہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ قیامت کے روز اس کلمہ کے لیے تمہارے پاس کیا جواب ہوگا؟ حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ اس جملہ کو بار بار دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میں نے آج ہی اسلام قبول کیا ہوتا!

ہم ایک دوسرے کو گمراہ یا کافر کہنے سے ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے اور آپس میں ہمارے سینے پھٹ جائیں گے۔ اور اس طرح ہم آپس میں اتحاد میں نہیں نفرت میں اضافہ کریں گے اور بغض وعناد کو بڑھاوا دیں گے۔

افسوس! آج ہمارا یہی حال ہے۔

جب کہ ایک مسلمان مفکّر کے بقول۔ آج مسلمانِ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے شدّت سے منتظر ہیں۔ مگر وہ ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ جہاں ایک طرف رحمت الٰہی کی آمد ہے اور دوسری طرف خدا کے دشمنوں کے حملے ہیں۔ جن کے باعث اسلامی دنیا بہت سے خطرات سے دوچار ہے۔

- مسلمانوں کے مقدس مقامات پہلے سے کہیں زیادہ غیر محفوظ نظر آتے ہیں۔
- عالم اسلام کے اندر پھوٹ ڈالنے کی کوششیں ایک نیا رُخ اختیار کر گئی ہیں۔
- اہم ترین ممالک دنیا کی زد میں ہیں۔
- سپر طاقتیں کھلے الفاظ میں فوجی طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دیتی ہیں۔
- اور جگہ جگہ اسلام دشمن قوتیں معمولی معمولی سہولتوں پر مسلمانوں سے اُن کے ایمان کے سودے کر رہی ہیں۔ اُن کے جان و مال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا کی عظیم طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور ظلم و بربریت کے باعث لاکھوں مسلمان وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر معمولی خیموں اور کھلے آسمان کے نیچے زندگی کا زہر پی رہے ہیں۔

ایسے سنگین اور خطرناک حالات میں مسلمانوں میں پھوٹ ڈالکر اور انتشار کی فضا کو برقرار رکھ کر اسلام کو سربلند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم متحد ہوں اور کلمہ توحید کی

طاقت سے ہم کنار ہوکر اسلام دشمن طاقتوں کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیں۔

ہم نے ایک دوسرے سے دوری اختیار کر رکھی ہے۔ اب ہم قریب آئیں۔ دوری سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور غلط فہمیاں مزید فاصلے پیدا کرتی ہیں۔

جب قریب آئیں گے۔ غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ نفرت اور عداوت کے دبیز پردے چاک ہوں گے۔

اندھیرا چھٹ رہا ہے

شہید مرتضیٰ مطہری علامہ خمینی کے ایک نامور شاگرد ہیں اور ایران کی اسلامی تحریک میں اُن کے قریب ترین معاونین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُن میں اسلامی نظریات کے دفاع کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان کی سنجیدہ منطق، پختہ استدلال اور وسعت نظر سے اسلام دشمن عناصر پریشان اور خائف رہے تھے انھوں نے مختلف موضوعات پر تقریباً پچاس کتابیں لکھی ہیں۔ "ایران اور مصر میں کتب سوزی"، خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے دفاع میں ان کی ایک اہم ترین کتاب ہے۔

استاد مطہری شہید نے اپنی اس کتاب میں انتہائی مضبوط دلائل کی بنیاد پر لکھا ہے۔

"جو کچھ خلیفہ دوم سے منسوب ہے اس کا تعلق حدیث نبوی کی کتابت سے ہے۔ ابتدا اسلام میں حضرت عمرؓ اور بعض صحابہؓ اور دوسری طرف حضرت علیؓ اور اُن کے ہم خیال چند صحابہ کے درمیان احادیث نبوی کی تدوین اور کتابت کے مسئلہ پر اختلاف نظر تھا۔ پہلے گروہ کے نزدیک جس کی قیادت حضرت عمرؓ کر رہے تھے۔ احادیث نبوی سننے، یاد رکھنے اور انھیں آگے نقل کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ البتہ وہ ان کی کتابت اور تدوین مکروہ خیال کرتا تھا۔ مبادا قرآن کے ساتھ اشتباہ ہو جائے اور قرآن کے لیے جو اہتمام کیا جاتا ہے اس کی جگہ حدیث لے لے۔"

علامہ شہید مطہری آگے لکھتے ہیں۔

جس شخص کے (رفاہ عامہ کے لیے) معاشرتی افکار اس سطح کے ہوں۔ وہ کتب خانے جلوائے یہ ایک ناقابلِ یقین امر ہے۔

حضرت عمرؓ اگرچہ سخت گیر تھے۔ لیکن کسی کو اُن کے تدبر اور دور اندیشی میں شک نہیں۔

وہ اس خیال سے کہ تمام ذمہ داریوں کا بوجھ تنہا اپنے کاندھوں پر نہ لیں اور دوسروں کی فکری صلاحیتوں سے بھی فائدہ اُٹھائیں۔ اہم مسائل بالخصوص اپنی حکومت کے خارجی سیاست کے امور پر مجلس شوریٰ بلاتے اور مشورہ لیتے تھے۔ ان کے اس معمول کے حوالے تاریخی کتب ہی میں نہیں بلکہ نہج البلاغہ میں بھی دو نمونے مل جاتے ہیں۔"

اور کتاب کے آخر میں علامہ موصوف نے "یہ اسلام کا مسئلہ ہے" کے تحت ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا ہے جو بہت سے متقیوں اور زاہدوں کی آنکھیں کھولنے اور دماغ روشن کرنے کے لیے کافی ہے۔

یہ اسلام کا مسئلہ ہے

علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

"چند سال پہلے میں نے مؤسسہ اسلامی حسینیہ ارشاد تہران میں اسکندریہ میں کتب سوزی کے موضوع پر دو تقریریں کیں اور اس واقعہ کے لغو اور بے بنیاد ہونے پر روشنی ڈالی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے ایک محترم مومن کی طرف سے خط ملا۔ جس میں مجھ سے کہا تھا کہ تجھے یہ واقعہ غلط ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر جھوٹ بھی ہے تو لوگوں کو بولنے دو۔ کیوں کہ یہ دروغ مصلحت آمیز ہے اور اس میں عمر بن خطابؓ اور عمرو بن عاصؓ کے خلاف تبلیغ ہے۔

یہ بزرگ سمجھ بیٹھے تھے کہ یورپ سے ہندوستان تک یہ جو شور مچا ہوا ہے (حضرت عمرؓ نے ایران اور مصر کے کتب خانے جلوائے تھے) اور جس پر کتابیں اور افسانے لکھے جا رہے ہیں حتیٰ کہ یہ مفروضہ قطعی طور پر منوانے کے لیے کتب منطق و فلسفہ اور امتحانی سوالات میں ٹھونسا جا رہا ہے۔ شاید حضرت عمرؓ یا حضرت عمرو بن عاصؓ کے خلاف جذبات کی ترجمانی ہے یا فریب حق اہل تشیع کی خدمت اور امیر المومنین علیؓ کے مخالفوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

ہمارے ایسے خوش فہم بزرگ نہیں جانتے کہ جس فضا میں یہ مسائل اُٹھائے جاتے ہیں۔ وہاں اسلام کا سوال آتا ہے۔ یہ سادہ لوح بزرگ نہیں سمجھتے کہ آج کسی دین اور اس کے آئین کے

خلاف موثر ہتھیار کلامی بحثیں اور ذہنی منطق کے استدلال نہیں ہیں بلکہ اس دین کے پیروکاروں کا تاریخ کے دھارے میں تمدنی اور تہذیبی مظاہر کے ساتھ روّیہ موافق یا مخالف موثر ترین ہتھیار ثابت ہوتا ہے۔"

ایران کے اسلامی قائدین میں سے ایک شیعہ عالم کا خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں یہ اظہار خیال، کیا ہمیں یہ سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتا کہ اسلام اور شریعت اسلام کے وسیع تر مفاد میں اب ہمارے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ کلامی بحثوں اور منطقی استدلال سے آگے بڑھ کر افہام وتفہیم سے کام لیں اور سنجیدگی کے ساتھ اختلافی امور کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔

حدیث رسولؐ کی غلط تفہیم

میں اپنے لیے کسی بھی طرح عالم دین ہونے کا تو دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور دینی امور پر صحیح معنٰی میں اظہار خیال کا حق علماء دین ہی کو ہوا کرتا ہے لیکن دین اسلام کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں نے جو کچھ مطالعہ کیا ہے اور معروضی مطالعے کے نتیجے میں جو حقائق میرے سامنے آئے ہیں۔ انتہائی خلوص نیت کے ساتھ انھیں آپ کے سامنے رکھ دوں۔

ہمارے بعض علماء حضرات فرماتے ہیں کہ مسلمان ملّت کا فرقوں میں بٹ جانا یقینی تھا۔ اس لیے کہ خود رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ میری اُمّت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اور ان میں ایک فرقہ ناجی اور باقی سارے فرقے ناری ہوں گے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث درست سہی۔ لیکن اس کی تفہیم صحیح نہیں کی جاتی ہے کہ خود مسلمانوں میں تہتّر فرقے ہو کر ایک ناجی اور باقی سارے کے سارے ناری ہوں گے بلکہ حق پسند علماء دین اس حدیث کا مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں اور یہ مفہوم ہماری سمجھ میں بھی آجائے تو بہت سے اختلافی مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کوئی رسول یا نبی نہیں آنا ہے۔ اس لیے آپؐ کی بعثت کے بعد سے جو بھی انسان اس دنیا میں پیدا ہو رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہوتا رہے گا۔ وہ آپؐ کی اُمّت میں شامل رہے گا۔ اور یہ اُمّت دو قسم کی ہوگی۔ ایک اُمّت اجابت اور دوسری اُمّت دعوت، اب جو انسان دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تو وہ اُمّت اجابت میں شامل ہے اور ناجی ہے اور جو ابھی دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوا ہے اس کا شمار اُمّت

دعوت میں ہوگا۔ اور وہ جب تک دعوت حق قبول نہ کرلے جہنّم کی آگ سے نہیں بچ سکتا۔

اس طرح مندرجہ بالا حدیث کے وسیع تر مفہوم کے تحت دنیا کے سارے مسلمان کسی بھی اسلامی فقہ کے پیروکار ہوں یا کسی بھی دینی مسلک کے حامل ہوں اُمّت محمدیؐ کا ایک فرقہ متصوّر کیے جائیں گے۔

سنّی اور شیعہ

ایک ہی سکّہ کے دو رُخ

اُمتِ مسلمہ میں یہ دو بڑے فرقے ہیں۔ اور ان میں باہمی طور پر بہت سے دینی امور میں اختلافات بھی ہیں۔ ابتدا میں ان اختلافات کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ صرف ایک خاص معاملہ میں نقطۂ نظر کا فرق تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد آپؐ کی جانشینی کا مسئلہ سامنے آیا کہ کس کو آپؐ کا جانشین اور مسلمانوں کا امیر ہونا چاہیئے۔ اس معاملہ میں دو نقطۂ نظر سامنے آئے۔

ایک، رسول اللہؐ کا جانشین اُن کے خاندان میں سے ہونا چاہیئے۔

دوسرا، رسول اللہؐ کا جانشین تمام مسلمانوں کے باہمی مشورہ اور تائید سے مقرر ہونا چاہیئے۔

جو حضرات پہلے نقطہ نظر کے حامی تھے۔ وہ شیعہ کہلائے اور جو حضرات دوسرے خیال کے حامی و مددگار تھے وہ اہلسنت کہلائے۔ لیکن اس اختلافِ نظر کے باعث کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔ اس لیے کہ اس طرح کے اختلافات متعدد بار خود حضور اکرمؐ کی موجودگی میں سامنے آئے تھے اور آپؐ نے اختلاف کرنے والے کسی فریق کی ملامت نہیں کی تھی۔

جیسا کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ میں پہنچ کر۔"

صحابہ کرامؓ آپؐ کا یہ ارشاد سن کر روانہ ہو گئے۔ لیکن ابھی راستہ میں تھے کہ کچھ لوگوں نے محسوس کیا کہ عصر کا وقت ختم ہونے کے قریب ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے نماز پڑھ لی اور رسول اللہ کے قول کی یہ تشریح کی کہ آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ ہم تیز چل کر جلد از جلد بنو قریظہ پہنچ جائیں نہ کہ نماز قضا کر دیں۔ لیکن دوسرے لوگوں نے آپؐ کے ظاہری الفاظ پر عمل کیا اور بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہ پڑھی۔

علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں۔

پہلے گروہ نے مدلول اور مقصد کو سمجھا اور دوسرے گروہ نے ظاہر کی الفاظ پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ یہ دونوں گروہ جیساکہ امام ابن القیم نے کہا ہے۔ ایک اہل الرائے والقیاس کا پیش رو ہے تو دوسرا اہل الظاہر کا۔ اس اختلاف کے سلسلہ میں اہم ترین بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں گروہوں کی بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے کسی کی ملامت نہیں کی نہ اِس گروہ کی نہ اُس گروہ کی۔ حالاں کہ دونوں گروہوں میں سے ایک ضرور غلطی پر ہونا چاہیے تھا۔ غرض اسی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب کسی فکر و عمل کی بنیاد اجتہاد پر ہو تو نہ اس کی تکفیر کی جائے گی اور نہ وہ گناہ گار ہوگا۔"

تاریخ کی گواہی

چنانچہ رسول اللہؐ کی جانشینی کے مسئلہ پر بھی اختلاف ضرور سامنے آیا لیکن کسی بھی گروہ نے دوسرے کی ملامت یا تکفیر نہیں کی۔ بلکہ جیساکہ ایک شیعہ عالم شیخ ہادی کاشفا الغطا نے مستدرک نہج البلاغہ سے نقل کیا ہے۔

"جب پیغمبر دنیا سے چلے گئے تو ان کے بعد مسلمانوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے ایک دوسرے سے کش مکش شروع کی۔ خدا کی قسم میرے دل اور ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ عرب حکومت کو میری جانب سے موڑ دیں گے اور مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ لوگ ابو بکرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن کی جانب بڑھے میں نے اُن سے اس لیے بیعت نہیں کی کہ میں لوگوں کے درمیان محمدؐ کی جانشینی کے لیے دوسروں سے زیادہ شائستہ ہوں۔ اس لیے جب تک خدا کی مرضی تھی۔ میں نے تامل سے کام لیا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ مرتد ہوکر اسلام سے پھر رہے ہیں اور لوگوں کو دین محمدؐ اور آئین ابراہیمی کی نابودی کی دعوت دے رہے ہیں۔ مجھے یہ خدشہ ہوا کہ اگر اسلام میں عظیم شگاف اور ویرانی کا مشاہدہ کروں گا۔ جس کی مصیبت ولایت اور اُن کے کام کی سرپرستی کے ختم ہونے سے زیادہ بڑھ گئی۔ کیوں کہ دنیا کا چند روزہ سامان مختصر ہے اور بعد میں سراب کی مانند محو ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں نے ابو بکرؓ کی مدد کی اور اُن کے ساتھ اُن حادثات میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ باطل ختم ہوگیا۔ اس کے بعد میں اسلام کی خیر خواہی کے لیے ابو بکرؓ کا ساتھ

دیتا رہا اور ان چیزوں میں جن میں وہ خدا کی اطاعت کرتے تھے۔ اپنی پوری کوشش کے ساتھ اُن کی معاونت کی۔ اس کے بعد جب وہ عالم سکرات میں پہنچے تو حکومت کو عمرؓ کے حوالے کیا اور ہم نے اُن کی بھی مدد کی۔"

حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت سے نظری اختلاف ضرور کیا لیکن عملاً آپؓ نے اُن کے ساتھ تعاون بھی کیا اور مدد بھی کی۔ اسی طرح شیعہ اولیٰ کا طرز عمل رہا۔ اور اختلاف نظر کے باوجود باہمی تعاون کا سلسلہ جاری رہا۔ اور تمام بنیادی امور میں اتحاد اسلامی کو باقی رکھا۔

مشہور اسلامی مورخ محترم اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اپنی کتاب "تاریخ زوال ملّت اسلامیہ" میں لکھتے ہیں۔

یہ لوگ (شیعہ اولیٰ) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حضرت عثمان غنیؓ کے بعد خلیفہ برحق مانتے اور اُن کے مخالفوں کو خطاوار جانتے تھے۔ لیکن حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو یہ لوگ بُرا نہیں کہتے تھے اور اُن کی نیت کو نیک بتاتے تھے۔ صرف خطائے اجتہادی کو اُن سے منسوب کرتے تھے۔ ان کو شیعہ مخلصین بھی کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد شیعہ اولیٰ میں سے کچھ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام صحابہ سے افضل جاننے لگے لیکن پہلے تینوں خلفاء کو بُرا نہیں کہتے تھے اس لیے کہ خود حضرت علیؓ اُن کے معاون و مددگار رہے تھے۔ ہاں یہ حضرات اپنے مخصوص خیالات کے باعث ایک الگ فرقہ ضرور تسلیم کیے گئے لیکن نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے اعمال میں وہ سب مسلمانوں کے ساتھ شریک اور قرآن و حدیث پر یکساں عامل تھے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

لیکن یہ نظری اختلاف رفتہ رفتہ گروہی اختلاف میں تبدیل ہوگیا۔ شیعانِ علیؓ حامیانِ اہلِ بیت اور حکومت وقت کے درمیان کی کش مکش اور تنازعات نے بہت جلد شیعہ سنّی تنازعات کی صورت اختیار کر لی۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

پھر عمل اور ردِّ عمل، کلامی بحثوں اور مناظرہ بازی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی۔ اس طرح اہل سنّت کے وسیع حلقہ میں شیعیت ایک ایسی ناپسندیدہ شے بن گئی جس نے اُمّت مسلمہ کے اتحاد کی ساری چولیں ہلاکر رکھ دیں۔ نفرتیں اور عداوتیں اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ اور ناخواندہ و نیم خواندہ لوگوں کی بات تو الگ رہی خود صاحبِ علم حضرات بھی اس سیلاب بلاخیز میں پوری طرح بہہ گئے۔

چنانچہ ایک ایرانی عالم حجۃ الاسلام محمد حسین آل کاشف الغطاء اپنی کتاب "اصل واصولِ شیعہ" میں وجہ تالیف کے تحت لکھتے ہیں کہ۔

"دو برس پہلے کی بات ہے۔ دیار مصر سے ایک عراقی طالب علم کا خط آیا۔ مکتوب خاصا طویل تھا جس کا ماحصل یہ ہے کہ مکتوب نگار نے جامعہ ازہر کے بڑے بڑے علماء سے تبادلۂ خیال کیا۔ باتوں باتوں میں نجف اشرف، اس کے دانش کدہ کے علماء پڑھنے لکھنے کے طریقوں اور مشہد علوی کی روشن فضا سے لو لگانے والوں کا ذکر آگیا۔ اس میں شک نہیں کہ قاہرہ کے علمی حلقے "جامعہ عظمیٰ نجف کی جی بھر کر تعریف کرتے ہیں اور یہاں کے دینی افاضل کی ذہنی تربیتوں سے کافی متاثر ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ہر مرتبہ یہ ضرور کہتے ہیں۔ ہائے! افسوس! وہ شیعہ ہیں۔

مکتوب نگار نے آگے لکھا ہے کہ مجھے اس پر بڑا تعجب ہوتا اور اکثر ان حضرات کی خدمت میں عرض کرتا تھا کہ صاحبو! شیعہ بھی ایک اسلامی فرقہ اور مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ملتا کہ "نہیں جناب" شیعہ مسلمان نہیں، تشیع کو اسلام سے کیا تعلق؟ بلکہ اسے تو مذاہب وادیان میں داخل کرنا ہی غلط ہے۔ کیوں کہ یہ ایرانیوں کی ایک اُپج اور اُموی حکومت کو عباسی شہنشاہیت میں بدلنے کا ایک سیاسی ڈھونگ تھا۔ اسے خدا کے بتائے ہوئے راستوں سے کیا تعلق؟

علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ میں سوچتا کہ مصر جیسا ملک، اسلامی علوم کا گہوارہ، عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کا مرکز نظر اور وہاں کے علماء اور دانش مندوں کے جہل اور عناد کا یہ عالم؟ کسی طرح یقین نہیں آتا تھا مگر اتفاقاً انہی دنوں مشہور مصنف احمد امین کی ایک کتاب "فجر الاسلام" ہاتھ آگئی۔

میں اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ لیکن جب شیعوں کے حالات تک پہنچا تو رنگ نگارش دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ فاضل مولف کتاب کیا لکھ رہے ہیں، ہوا میں محل کھڑا کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ عرصہ بعد ایک ملاقات کے دوران جب میں نے احمد امین صاحب سے اس کی شکایت کی تو اُن کا جواب تھا ایسا عدم واقفیت اور کتابوں کی قلّت کے باعث ہوا ہے۔ معًا یہ خیال آیا کہ جب احمد امین جیسا صاحب قلم اس نفسیات کا حامل ہے تو ناخواندہ اور نیم خواندہ عوام کا کیا حال ہوگا؟ حالاں کہ یہ وقت اس بات کا متقاضی ہے کہ آج ہر مسلمان وحدت و اخوت کا حامی و مددگار بنے اور اس حقیقت پر یقین رکھے کہ اگر اُمت محمدیؐ کا شیرازہ بکھر گیا تو نہ زندگی بھلی نہ موت!"

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ہمارے مسلمان بھائی مذہب شیعہ کی حقیقت سے آگاہ ہوتے اور انصاف بھی کر سکتے تو ایسے لٹریچر کا وجود ہی نہ ہوتا۔ جس سے عداوت باہمی کی طرح پڑے نیز استعماری طاقتوں اور بے دین عناصر کی مرادیں پوری ہوں۔"

غالباً آج یہی احساس میں اپنے اندر پا رہا ہوں کہ اگر شیعیت وہ نہیں ہے۔ جس کو ہم نے عدم واقفیت کی بنا پر دور رہ کر سمجھا ہے تو پھر ہمیں اتحاد اسلامی کے عظیم تر مفاد کی خاطر حقیقت سے واقفیت حاصل کرنا چاہیے کہ اصلاً شیعیت کیا ہے؟

شیعیت کیا ہے؟

علامہ محمد حسین آل کاشف الغطار نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایک کتاب بعنوان "اصل واصول شیعہ" تالیف کی ہے، جس کے بارے میں انھوں نے اسی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے ۔

میں نے صرف ایک ادائے فرض کے ناطے یہ کتاب تالیف کی ہے اور اس سلسلہ میں میرے لیے یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ نہ تو مجھے شیعوں کی طرف سے دفاع کرنا مقصود ہے اور نہ سواد اعظم کی افترا بازیوں کا جواب دینا چاہتا ہوں بلکہ سب سے بڑا مدعا یہ ہے کہ عام اسلامی حلقوں سے عدم واقفیت کی تاریکی دور ہو، حقائق سامنے آئیں ۔ عناد رکھنے والوں کے لیے حجت پوری ہو جائے اور شیعیت کی صحیح شکل وصورت واضح ہو جائے ۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی باہمی کش مکش کا خاتمہ ہو۔

آیئے، اسی کتاب سے شیعیت کا مطالعہ کریں۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

"قبل اس کے ہم اصول وفروع کو جدا جدا مباحث میں بیان کریں۔ مجموعی طور پر تمام مسائل کو عمومی اعتقاد کے تحت پانچ کلیات پر منقسم کرتے ہیں۔

۱۔ خالق کی معرفت۔

۲۔ اس کے مبلغ کی شناخت۔

۳۔ مسائل عبادت اور طریق عمل کی پہچان۔

۴۔ نیکیوں کا حصول اور برائیوں سے اجتناب۔

۵۔ معاد (آخرت) اور سزا وجزا کا اعتقاد۔

اس لحاظ سے دین کے دو شعبے ہوئے "نظری اور عملی" عام اعتبار سے "اسلام وایمان" مترادف ہیں۔

توحید، نبوت اور معاد (آخرت) اسلام کے تین بنیادی رکن ہیں۔ اگر کوئی شخص ان ارکان

میں سے کسی رُکن کا منکر ہو تو وہ مسلم ہے نہ مومن اور اگر ان ارکان پر ایمان لے آئے تو حسب ارشاد باری تعالیٰ۔ من آمن باللہ ورسولہ والیوم الآخر یعنی جو اللہ، اُس کے رسول اور آخرت پر ایمان لایا۔ اس کا شمار مسلمانوں میں ہوگا۔ اور اسے مسلمانوں کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے۔

اس کے بعد اس کی مختصر سی تشریح، فرائض خمسہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کا ذکر کرتے ہوئے علامہ موصوف نے لکھا ہے۔

(اس طرح) ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراصل قول، یقین اور عمل کے مجموعہ کا نام ایمان ہے۔ اور یہ جمہور اسلام کے اساسی نظریات کا خلاصہ ہے۔ لیکن شیعوں نے ان ارکان کے ساتھ ایک اور رکن کا اضافہ کر لیا ہے اور یہ بنیادی مسئلہ ہے عقیدہ امامت!

منصبِ الٰہی

شیعی نقطہ نظر کے مطابق امامت، نبوت کی طرح منصب الٰہی ہے۔ جس طرح خداوند عالم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا نبوت و رسالت کے جلیل القدر عہدہ کے لیے منتخب فرماتا۔ اسی طرح امامت کے معاملے میں بھی کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ خود ربّ العزت اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ وہ شخصِ منتخب کی امامت کا اعلان کر دے۔ رسول حسب الحکم فرائض شریعت کی تکمیل کے لیے نص کے ذریعہ اپنی چنی ہوئی ذات کو خلق کا پیشوا بنا دیتا ہے۔ نبیؐ اور امام میں فرق یہ ہے کہ نبیؐ پر وحی نازل ہوتی ہے اور امام خصوصی توفیق کے ساتھ رسولؐ سے احکام حاصل کرتا ہے۔

پس رسولؐ خدا کا پیغام رساں ہے اور امام رسول کا پیغام رساں ہے۔ (اس طرح) امام کمالات کے اعتبار سے نبی سے کم اور عام مخلوق سے بہت بلند ہوتا ہے۔

اب اگر کوئی شخص امامت کا قائل ہو تو وہ شیعی روایات کے لحاظ سے خاص معنوں میں مومن کہلاتا ہے اور اگر وہ چار ہی ارکان (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج) کا مقر ہو جو عام مسلمانوں کا مرکز اعتقاد ہیں تو اُسے عام معنوں "مسلم و مومن" کہیں گے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام احکام اسلام اس پر مرتب ہوں گے، اُس کی جان، مال اور عزت و آبرو وغیرہ کا احترام کرنا فرض قرار پائے گا۔

صرف امامت کا اقرار نہ کرنے سے کوئی فرد اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے تمام مسلمان یکساں ہیں اور ایک دوسرے کے کفو!

عام مسلمانوں میں شیعہ جو ایک الگ امتیازی حیثیت کے حامل ہیں وہ صرف اس وجہ سے کہ یہ ائمہ اثنا عشر کی امامت کے معتقد ہیں اور اسی بنا پر اس فرقہ کو "امامیہ" کہتے ہیں۔

لیکن، یہ خیال رہے کہ سارے شیعہ امامیہ نہیں ہیں۔ کیوں کہ لفظ شیعہ کا اطلاق زیدیہ، اسماعیلیہ، واقفیہ اور فطحیہ وغیرہ پر بھی ہوتا ہے اور یہ تو شیعوں کے وہ فرقے ہیں جو مسلمانوں میں شامل ہیں۔ اگر ہم دامن نظر کو اور پھیلا دیں تو شیعوں کے نام سے بہت ایسے فرقے بھی ملیں گے جو دائرہ اسلام سے قطعاً خارج ہیں مثلاً خطابیہ وغیرہ اور اس طرح نہ سو بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ فرقوں کی فہرست تیار ہو جائے گی۔

ائمہ اثنا عشرہ

"اسلامیات میں ائمہ اثنا عشرہ کا عقیدہ کچھ نیا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی جملہ معتبر و مستند کتابوں میں یہ ذکر موجود ہے۔ امام بخاری و مسلم نے اپنی صحیحین میں متعدد طریقوں سے حدیث اثنا عشرہ کو بیان کیا ہے۔"

اس دعوے کے بعد علامہ موصوف نے چند احادیث درج کی ہیں۔

جابر ابن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ اپنے والد کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ نظام اُس وقت تک ختم ہونے والا نہیں کہ جب تک بارہ (۱۲) خلیفہ نہ گزر جائیں۔ اس کے بعد حضور اکرمؐ نے آہستہ سے کچھ فرمایا جو میں نہیں سن سکا۔ اپنے والد سے دریافت کیا کہ اس کے آگے سرور رسالتؐ نے کیا ارشاد فرمایا۔

جواب ملا۔ نبیؐ کریمؐ کا فرمان ہے کہ یہ سب قریش سے ہوں گے۔"

دوسری روایت ہے کہ ــــ

"جب تک بارہ مقتدر رہیں گے۔ یہ معاشرہ یوں ہی برقرار رہے گا۔ نیز

جب تک بارہ۱۲ خلفاء رہیں اسلام کی شان و شوکت باقی رہے گی۔"

خدا جانے یہ بارہ۱۲ خلیفہ کون ہیں ؟ سوادِ اعظم میں نور رسالت مآب کا یہ قول مشہور ہے کہ میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی۔ پھر حرص و آز اور مکر و فریب کی اماجگاہ بن جائے گی۔

مندرجہ بالا احادیث درج کرنے کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ یہاں ہمیں بحث و استدلال سے مطلب نہیں صرف عقیدہ سے غرض ہے (اور یہ بارہ اماموں کا عقیدہ ان احادیث سے ثابت ہو رہا ہے)

"شیعہ امامیہ مسلمان ہیں۔ وہ بھی اللہ، اس کے رسولؐ اور قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو کچھ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں ان پر بھی وہ ایمان رکھتے ہیں اور ان کا مذہب وہی ہے جو بلاد فارس میں رائج ہے۔"

(اصول الفقہ" از: استاد احمد ابراھیم بیگ)

"اس کا مقصد اہلِ سنّت اور شیعہ جعفریہ کو نزدیک لانا اور یہ بتانا ہے کہ ان دونوں کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ صرف اجتہادی ہیں جن کی اسلام نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ ان کی رغبت بھی دلائی ہے۔ یہ درست نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں پھیلائیں۔ اپنی تحقیقات میں کسی تعصّب اور جانبداری سے کام لیئے بغیر ہم نے شیعوں کو وہی مقام دیا ہے جو انھیں ملنا چاہیئے۔"

("بین الشیعہ واھل السنّت" از: ڈاکٹر عبدالواحد وافی

پرنسپل جامعہ الازھر)

اُصولِ دین

علامہ کاشف الغطاء صاحب نے ان ضروری اور ابتدائی باتوں کے بعد اپنے بنیادی عقائد سے متعلق مختصراً ہی سہی لیکن واضح انداز میں گفتگو کی ہے۔ میں یہ گفتگو من وعن صرف جملوں کی تراش خراش میں دخل اندازی کرتے ہوئے پیش کر رہا ہوں۔

علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

شیعی نقطۂ نظر سے مذہب دو شاخوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ "علم اور عمل" یعنی کچھ مسائل کا تعلق عقل سے ہے اور کچھ مسائل جسم سے متعلق ہیں۔ وہ مسائل جن کا تعلق علم یعنی عقل سے ہے۔ انھیں "اصولِ دین" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور ان کی تعداد پانچ ہے۔

۱۔ توحید۔

۲۔ نبوّت۔

۳۔ امامت۔

۴۔ عدل۔

۵۔ معاد۔

اب ہم ہر مبحث پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالتے ہیں۔

توحید

امامیہ اعتقاد کے لحاظ سے ہر ہوش مند کا عقلی فرض ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے اس کی معرفت حاصل کرے اور اس کی وحدانیت اور الوہیت کا معتقد ہو۔ ربوبیت میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دے۔ اس کا یقین رکھے کہ خلق و رزق، موت و حیات اور ایجاد و اعدام اُسی ذات

سے متعلق ہے بلکہ اس عالم ہست و بود میں صرف اُسی کی قدرت کاملہ کا عمل دخل ہے۔ اور اگر رزق و خلق یا موت و حیات کو کوئی شخص خدا کے علاوہ کسی اور سے منسوب کرے تو اُسے کافر و مشرک اور اُسے دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اطاعت و عبادت میں اخلاص ضروری ہے یعنی کوئی معبود مطلق کے ساتھ کسی اور شے کی عبادت بجالائے۔ اس کے سوا کسی اور کی پرستش کرے۔ نیز اُسے تقرّب کا وسیلہ بنائے تو وہ بھی امامیہ مذہب کے حکم سے کافر متصوّر ہوگا

سوائے وحدہٗ لاشریک کے کسی کی عبادت جائز نہیں، نیز بغیر ذات باری تعالیٰ، انبیاء کرام اور آئمہ اطہار کسی کی اطاعت بھی روا نہیں۔

انبیاء اور آئمہ کی اطاعت بھی بالواسطہ خدا کی اطاعت ہے۔ کیوں کہ یہ احکام الٰہی کے مبلّغ ہیں۔ لیکن خدا کی عبادت سمجھ کر ان کی اطاعت ناجائز ہے اور قطعاً شیطانی فریب!

البتہ ان ذوات مقدسہ سے طلب برکت اور انھیں اپنے اور اپنے معبود کے درمیان وسیلہ قرار دینا۔ نیز ان کے مزاروں پر اللہ کی عبادت بجالانا جائز ہے کیوں کہ پرستش ان کی نہیں خدا کی ہے۔

امامیہ فرقہ کا "عقیدہ توحید" یہ ہے۔ جس پر ہمارے تمام علماء متفق و متحد ہیں۔

نبوت

نبوت کے بارے میں امامیہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء جو منصوص من اللہ ہیں۔ وہ سب کے سب خدا کے فرستادہ اور اُس کے برگزیدہ بندے ہیں۔ یہ سب دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاتم الانبیاء اور سید المرسلین ہیں۔ آپؐ بالکل معصوم تھے۔ نہ کوئی گناہ سرزد ہوا نہ لغزش زندگی بھر حضور اکرمؐ مرضیٔ حق کے مطابق عمل کرتے رہے اور مالک مطلق نے آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی، وہاں سے آپ نے جسم مبارک کے ساتھ عرش و کرسی نیز ماورائے حجب و سرادق تک پہنچے اور اپنے معبود سے اتنے قریب ہوگئے کہ "قاب قوسین" بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ وہ کتاب جو اس

وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ وہی ہدایت نامہ ہے۔ جسے پروردگار عالم نے معجزہ بنا کر نازل کیا اور اس کے ذریعہ سے احکام دین کی تعلیم دی۔ نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیاتی مسلمانوں میں جو لوگ تحریف کے قائل ہیں وہ خطا پر ہیں۔

موجودہ قرآن کی عدم تحریف پر تمام علماء کا اجماع ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی روایت ہے تو اُسے غیر معتبر سمجھا جائے گا۔ کیوں کہ جو احادیث طریقِ احاد سے ہمدست ہوتی ہیں وہ مفید علم و عمل نہیں قرار پا سکتیں بالفاظ دیگران کا کوئی اعتقاد نہیں۔ نیز شیعہ امامیہ کا یہ عقیدہ راسخہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے بعد جو شخص بھی نبوت یا نزول وحی کا دعویٰ کرے وہ کافر اور واجب القتل ہے۔

امامت

امامت! یہی وہ امتیاز کی مسئلہ ہے جس کی بنا پر شیعہ فرقہ عام مسلمان فرقوں سے الگ تھلگ نظر آتا ہے اور یہی وہ اساسی اور بنیادی فرق ہے جو اس مکتبہ خیال کو دوسرے مکاتب سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو اختلافات ہیں۔ ان کی حیثیت اصولی نہیں بلکہ فروعی ہے۔ اس قسم کے ذیلی اور ضمنی اختلافات خود سواد اعظم کے ائمہ اجتہاد میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً حنفیوں کے بہت سے مسائل شافعیوں سے میل نہیں کھاتے اور ان کے اُن سے!

امامیہ فرقہ کے نزدیک امامت وہ منصب الٰہی ہے جو نبوت کی طرح پروردگار عالم کی جانب سے ہدایت خلق کے لیے عطا ہوتا ہے اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب باری تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ وہ علیؓ ابن ابی طالب کو اپنا جانشین مقرر کریں تاکہ ختم نبوت کے بعد کار تبلیغ جاری رہے۔

شیعہ امامیہ اس امر کے معتقد ہیں کہ ہم علیؓ کے ساتھی ہیں اور آپ ہی کے پیرو، (حضرت) علیؓ جس کے دوست ہم اُس کے دوست اور (حضرت) علیؓ جس کے دشمن ہم بھی اُس کے دشمن ہیں۔ اور یہ اعتقاد پیغمبر اکرمؐ کے اس ارشاد پر مبنی ہے کہ۔

"پروردگار! جو علیؓ کا دم بھرے تو اُسے دوست رکھ اور جو علیؓ سے بغض

باندھے تو اُس سے دُشمنی کر۔"

امامیہ شیعوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خلاق عالم صفحہ گیتی کو کبھی کسی نبیؑ یا اُس کے وصی کے وجود سے خالی نہیں رکھتا۔ عام اس سے کہ یہ حجت ظاہر ہو یا غائب۔

سرورِ کائنات نے نص صریح کے ذریعہ علی مرتضیٰؓ کو اپنا وصی بنایا، علی نے حسن مجتبیٰ کو جانشین کیا اور امام حسنؓ نے اپنے بھائی سید الشہدا امام حسینؓ کو یہ امامت سپرد کی۔ اسی طرح یہ سلسلہ گیارہویں امام تک پہنچا۔ گیارہویں رہبر امام حسن عسکریؒ نے اپنے صاحبزادے بارہویں امام حضرت مہدی منتظر کو صاحب الامر قرار دیا۔

اس کے بعد شیعہ امامیہ کے اس اعتقاد کو سنّت الٰہیہ "بتائے ہوئے بطور ثبوت علامہ موصوف نے قرن اوّل اور قرن ثانی کے ایسے بہت سے علمار دین کے نام درج کیے ہیں جنھوں نے وصیت کے عنوان سے خامہ فرسائی کی ہے۔

عَدل

خُداوندِ عالم کسی پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اُس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جس کو عقل سلیم بُرا سمجھے۔ اس اعتقاد کا نام عدل ہے۔

عدل باری تعالیٰ کی صفات عالیہ میں سے ایک صفت ہے۔ جس کا وجود جامعیت صفات کمال و جمال الٰہیہ کے لیے ضروری ہے اور شان توحید کے واسطے لازم سمجھا جاتا ہے اس باعث اس مسئلہ میں مذہب امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ عادل ہے اور انسان آزاد اور خود مختار ہے۔

معاد

عام مسلمانوں کی طرح شیعوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ پیدا کرنے والا جزا و سزا اور حساب و کتاب کے لیے قیامت کے دن تمام خلق کو زندہ اور محشور کرے گا۔

معاد کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر شخص بذات خود بعینہٖ اپنے جسم و روح کے ساتھ میدان حشر

میں اس طرح حاضر ہوگا کہ ہر پہچاننے والا دیکھ کر کہہ دے۔ ہاں، یہ فلاں شخص ہے۔

اس سلسلہ میں یہ جاننا ضروری نہیں کہ یہ واپسی کس انداز سے ہوگی۔ البتہ حشر ونشر کے ضمن میں کتاب اللہ اور احادیث صحیح میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے۔ وہ سب جزو ایمان ہے۔ جیسے عقیدہ دوزخ و بہشت، برزخ کی آسائش اور عذاب، میزان، صراط، اعراف اور اعمال نامہ جو زندگی کی کتاب ہوگا۔

علاوہ ازیں شیعہ اس کے بھی معترف ہیں کہ ہر شخص اپنے اعمال کے لحاظ سے جزا و سزا کا مستحق ہوگا۔ نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدلہ بدی کی صورت میں سامنے آئے گا۔

نظامِ عمل

وہ مسائل جن کا تعلق عمل سے ہے انھیں نظام عمل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ اعمال تین اقسام پر مشتمل ہیں۔

۱۔ وہ اعمال جو خدا اور بندہ سے متعلق ہیں۔ انھیں "عبادات" کا نام دیا جاتا ہے ان کی صحت خدا سے قریب ہونے پر موقوف ہے۔

یہ عبادت یا تو جسمانی ہوتی ہے جیسے نماز، روزہ اور حج یا مالی جیسے زکوٰۃ اور کفّارات۔

۲۔ وہ اعمال جن کا تعلق فرد اور سماج سے ہوتا ہے۔ ان کی بھی دو صورتیں ہیں۔ دو فریقوں سے وابستہ مثلاً لین دین، شادی بیاہ اور ایک ہی فریق سے مختص جیسے طلاق اور محبت وغیرہ۔

۳۔ وہ اعمال جو بالکل شخصی یا ذاتی ہوتے ہیں۔ جیسے کھانا، پینا، پہننا اوڑھنا۔

علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ فقہ ان تمام اعمال کے جملہ احکام سے چار ابواب میں بحث کرتی ہے۔"

شیعوں کے اعتقاد پر گفتگو کرنے کے بعد یہ ضروری نہیں ہے کہ اُن کے اعمال کا بھی جائزہ لیا جائے۔ لیکن شیعہ سنّی اختلافات نے اہل سنّت کے درمیان شیعوں کے روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کو بھی مشتبہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا مناسب ہی نہیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظام عمل کے پہلے باب "عبادت" پر گفتگو کر لی جائے۔

چنانچہ یہ مسائل بھی "اصل واصول شیعہ" سے استفادہ کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔

محترم کاشف الغطاء صاحب لکھتے ہیں۔

اہم ترین عبادتیں چھ ہیں۔ دو جسمانی۔ نماز اور روزہ، دو مالی۔ خمس اور زکوٰۃ اور دو

ملی جلی یعنی جسمانی اور مالی دونوں۔ حج اور جہاد۔

نماز

تمام مسلمانوں کی طرح شیعہ بھی نماز کو دین کا رکن سمجھتے ہیں۔ یہ عبادت بندے کو خدا سے قریب کرنے کا وسیلہ ہے۔ اگر یہ عمل چھوٹ جائے تو عبد و معبود کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ اسی لیے اہل بیت کی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک دو نمازوں کا چھوڑنا ہی کفر و اسلام کا درمیانی فرق ہے۔

شریعت کی رو سے نماز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کوئی عبادت بھی اس کے مقابل نہیں اور بالاتفاق فرقہ امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ تارک الصلوٰۃ فاسق ہے۔ اسلامی معاشرہ میں اس کا کوئی مقام نہیں، نہ وہ قابلِ اعتبار ہے اور نہ لائق اعتماد نیز اس کی غیبت بھی جائز ہے۔

اصولاً پانچ قسم کی نمازیں واجب ہیں۔

فرائض پنجگانہ، نماز جمعہ، نماز عیدین، نماز آیات اور نماز طواف لیکن بعض وقت خود مکلّف کسی وجہ سے اپنے اوپر نماز واجب کر لیتا ہے۔ مثلاً نذر مان کر یا قسم کھا کر یا نماز پڑھنے کی اُجرت لے کر اُن کے علاوہ باقی سب نوافل ہیں۔

ان نمازوں کے علاوہ ماہ رمضان کے نوافل کو بڑی عظمت اور اہمیت حاصل ہے جن کی تعداد ایک ہزار رکعت ہے۔ اہل سنّت یہ نماز باجماعت تراویح کے نام سے پڑھتے ہیں لیکن شیعی نقطہ نظر سے ان نمازوں میں جماعت مشروع نہیں ہے کیوں کہ کلیہ یہ ہے کہ جماعت صرف واجب نمازوں کے لیے ہے۔

روزہ

امامیہ عقیدہ کے مطابق روزہ شریعت اسلامیہ کا ایک رکن ہے۔ احکام کے لحاظ سے اس کی چار قسمیں ہیں۔

واجب، مستحب، حرام اور مکروہ۔ واجب روزے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ شریعت کے واجب کردہ جیسے رمضان کے روزے۔
۲۔ جو کسی سبب سے واجب ہو گئے ہیں جیسے صوم کفّارہ، بدل ہدیٰ، نیابت اور نذر وغیرہ کے روزے۔

رجب اور شعبان کے روزے مستحب ہیں۔ نیز ان کے علاوہ اس زمرے میں اور بہت سے روزے ہیں جو مستحب کے ذیل میں آتے ہیں۔

عیدیں اور ایام تشریق کے روزے حرام ہیں اور صوم عاشورہ اور عرفہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

رمضان کے روزوں کا شیعہ اس قدر احترام و اہتمام کرتے ہیں جو بہت زیادہ ہے۔ بہت سے لوگ تو مرض الموت اور جان لیوا پیاس میں بھی اس عبادت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

زکوٰۃ

شیعوں کے نزدیک نماز کے بعد زکوٰۃ کا مرتبہ ہے بلکہ ائمہ اطہار کی بعض احادیث میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جو زکواۃ نہ دے اُس کی نماز ہی درست نہیں۔

عام مسلمانوں کی طرح امامیہ شیعہ بھی نو چیزوں پر زکواۃ واجب سمجھتے ہیں۔

زکوٰۃ کے وجوب، استحباب کے کچھ شرائط وضوابط ہیں جو اپنے اپنے مقام پر مذکور ہیں اس سلسلہ میں تقریباً تمام قواعد مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے مطابق ہیں۔

خمس

خمس سات چیزوں پر واجب ہوتی ہے۔

دارالحرب کا مال غنیمت، غوّاصی (غوطہ زنی) سے حاصل شدہ جواہر و معادن و نباتات، پوشیدہ خزانے۔ معدنی اشیاء، حلال حرام آمیز مال، کاروبار کے منافع۔ مسلم سے ذمّی کو منتقل شدہ اراضی۔

خمس کی اصل واساس پروردگار عالم کا یہ ارشاد ہے۔

آگاہ ہو کہ جو اموال بطور غنیمت دستیاب ہوں ان کا پانچواں حصّہ خدا، رسول، ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کا ہے (سورہ انفال)

اس ضمن میں شیعہ امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ خمس وہ حق ہے جس کو خداوند کریم نے آل محمدؐ کے لیے مختص فرمایا ہے۔ کیوں کہ اولاد رسولؐ پر صدقہ حرام ہے۔

حج

شیعہ عقائد میں حج اسلام کا بہت بڑا ستون ہے۔ اس فریضہ کے ترک کرنے والے کو پاداش جُرم میں یا تو یہودیوں کی طرح مرنا ہوگا یا نصاریٰ کی سی موت قبول کرنا پڑے گی۔ اس سے روگردانی کفر کی حدوں کو پہنچا دیتی ہے اس آیت مبارکہ :۔

"استطاعت کے باوجود حج سے انکار کرنے والے کو خیال ہونا چاہیے کہ اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے۔" (آل عمران)

کا اشارہ اسی جانب ہے۔

بلوغ، عقل، آزادی، بالخصوص استطاعت، صحت بدن اور اطمینان راہ حج کے عمومی شرائط ہیں۔ جن کی تکمیل پر زندگی میں صرف ایک مرتبہ حج واجب ہے۔

علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

ہم علماء اہل سنّت کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بہ یں سلسلہ ان کے بہت سے مسائل ہمارے مسائل سے میل کھاتے ہیں اور جہاں اختلاف ہے وہ بہت معمولی نوعیت کا ہے۔

غرض شیعوں کے نزدیک حج کی بڑی اہمیت ہے۔ اور وہ اس فرض کی ادائیگی کا حد درجہ خیال رکھتے ہیں۔

جہاد

جہاد اسلام کی عالیشان عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دین حق نہ دنیا کے لیے وجہ رحمت بنتا اور نہ انسانیت کے واسطے باعث برکت ثابت ہوتا۔

ظلم اور ظالموں کی مقادمت اور فتنہ و فساد کی روک تھام کے لیے جان و مال کو راہ خدا میں قربان کر دینے کا نام جہاد ہے۔

مذہب شیعہ میں اس کی دو اقسام ہیں۔ جہاد اکبر اور جہاد اصغر۔

اس باطنی دشمنی کا مقابلہ جس کو "نفس" کہتے ہیں اور اس کے برے اثرات یعنی جہالت بزدلی، جور و جفا اور حسد و بخوت وغیرہ سے برسر پیکار ہونا جہاد اکبر ہے۔ "سب سے بڑا دشمن نفس ہے جو تمہارے پہلو سے لگا ہوا ہے" اور جہاد اصغر سے مراد اس ظاہری دشمن کی مدافعت سے ہے جس کو عدل و انصاف، امن و شرافت اور دین و صداقت سے بیر ہو۔

شیعہ حضرات کے اصولِ دین اور نظام حمل کے پہلے باب عبادات سے مختصر سا تعارف حاصل کرنے کے بعد یقینی طور پر بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جانا چاہئیں اور اب ہمیں اس بابت کسی طرح کا شک و شبہ نہ ہونا چاہیے کہ شیعہ فرقہ اسلام کا ہی ایک فرقہ ہے۔ اور یہ بات میں آپ سے یونہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انھیں حقائق کا باعث بڑے بڑے اہل سنّت کا یہی خیال ہے۔

شیخ امام محمد ابوزہرہ اپنی کتاب "تاریخ اسلام کے مختلف مکتبہ فکر" میں لکھتے ہیں کہ شیعیت بھی اسلام ہی کا ایک فرقہ ہے۔ ہاں ایسے لوگ جو علیؓ کو خدا مانتے ہیں خود شیعہ انھیں کافر و مرتد گردانتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں۔"

اخوان المسلمون عراق کے ایک اہم رکن ڈاکٹر عبدالکریم زیدان اپنی کتاب "اسلام کے مختلف فرقوں کا مطالعہ" میں لکھتے ہیں کہ فرقہ جعفریہ ایران، عراق، ہندوستان، پاکستان اور لبنان میں پایا جاتا ہے۔ شام اور دوسرے مسلم ممالک میں بھی فقہ جعفری کے ماننے والے موجود ہیں۔ فرقہ جعفریہ اور دوسرے مکاتب خیال میں بس اتنا ہی فرق ہے، جتنا دوسرے

دو مکاتب فکر کے درمیان ہے۔

ڈاکٹر صالح اپنی کتاب "اسلامی فرقوں کے نقش و نگار" میں لکھتے ہیں کہ شیعہ ائمہ نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو سنت نبوی کے مطابق نہو۔ قرآن مجید کے بعد شیعہ احادیث نبوی کو ہی قانون سازی کی اساس اور بنیاد قرار دیتے ہیں۔

ان اہم ترین شہادتوں کے علاوہ سید اسعد گیلانی سکریٹری جماعت اسلامی پاکستان کی شیعہ حضرات کے بارے میں یہ گواہی بھی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور اس تازہ ترین گواہی سے ہمیں صحیح حقائق کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوگی۔

سید صاحب ایران میں اسلامی انقلاب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ایک ایرانی عالم دین سے ہونے والی اپنی گفتگو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

قم ہی میں میں نے ایک پُرجوش ایرانی عالم سے بات چیت کی جو انگریزی بہت عمدگی سے بولتے تھے۔ نمازیں ہم نے ایک ساتھ پڑھی تھیں۔ اور وہ بہت مانوس ہو کر باتیں کر رہے تھے۔

"محترم! ہمارے علم میں جو شیعہ مسلک ہے۔ اس میں ہم سے علیحدگی اور دوری کا رجحان بہت ہے اور وہ آپ سے کچھ مختلف ذوق رکھتا ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟" میں نے جھجکتے ہوئے عرض کیا۔

وہ مسکرائے اور گویا ہوئے۔ میں آپ کا مفہوم سمجھ گیا ہوں۔ آپ نے بہت محتاط انداز میں بات کی ہے۔ لیکن میں وضاحت سے بات کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو حقیقت حال کا علم ہو جائے۔

"ایران میں علوی شیعہ حضرات کی اکثریت ہے اور یہ علوی شیعہ حضرات تمام صحابہ کرامؓ کے بارے میں احترام کا رویہ رکھتے ہیں۔ صرف فضائل و نیابت کے باعث حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیتے ہیں۔ جب کہ اہل سنت حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کو فضیلت دیتے ہیں اور ظاہر ہے یہ منصوص چیز نہیں ہے۔ صرف ذوق اور عقیدت کا مسئلہ ہے۔"

اس طرح شیعہ اور سنی محترم ابو الحسن علی ندوی کے بقول "دو متضاد تصویریں نہیں

بلکہ ایک سکّہ کے دو رُخ ہیں۔ اور جس طرح دونوں رُخ سکّہ کو مکمل کرتے ہیں۔ اسی طرح سنی اور شیعہ اسلام میں تضاد نہیں بلکہ اس کی ہمہ جہتی تکمیل کرتے ہیں۔ اور اس تکمیل کی یوں تو ہمیشہ ہی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور سید جمال الدین افغانی نے اس ضرورت کو جس شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا آج اس سے بھی کہیں زیادہ اس کی ضرورت ہے۔

شیعہ حضرات کے بارے میں مختصراً ہی سہی لیکن یہ بات دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے آچکی ہے کہ بعض علماء حضرات نے شیعہ اہل بدعت کو سامنے رکھ کر تمام شیعوں کی جو تصویر دکھانے کی اکثر کوشش کی ہے وہ شیعہ اہل سنّت یا شیعہ اہل حق کی اصل تصویر نہیں ہے۔ اسی طرح شیعہ اہل حق کی صحیح تصویر سامنے آنے کے بعد یہ بات بھی خود بخود ثابت ہو جاتی ہے یہ چیز محض ایک غلط پروپیگنڈہ سے زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اُن چند مسائل پر گفتگو کر لی جائے جن مسائل کی غلط تاویل کر کے شیعہ حضرات کو اکثر کفر کے درجہ تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور آج بھی دین حق کے علم بردار ہونے کا دعویٰ کرنے والے چند مٹھی بھر علماء اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی آخرت سے بے نیاز ہو کر تمام شیعوں کو مسلمان سے کافر بنا دیں۔

مسئلہ امامت

یہ مسئلہ اپنی نوعیت اور اثرات کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے سلسلہ میں عام اہل سنّت کا معاملہ تو درکنار شاید اہل سنّت علماء بھی زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ اور کسی بھی معاملہ سے متعلق عدم واقفیت اور لاعلمی ہمیشہ بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہے۔ مسئلہ امامت کے بارے میں ہمارے درمیان بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ لیکن میں اس وقت اُن کا ذکر نہ کر کے سیدھے مثبت انداز میں مسئلہ امامت سے متعلق مستند شیعہ علماء کی آراء اور نظریات آپ کے سامنے رکھتا ہوں جو خود میرے مطالعہ میں آئے ہیں۔ اور جن پر ہمیں یقین کرنا چاہیے لیکن اس لیے نہیں کہ انھیں ہم قبول کر لیں بلکہ اس لیے کہ کسی جھوٹ کے مقابلہ میں ایک سچائی سے واقف ہو جائیں۔

امامت کا مفہوم

"امامت ولایت اور حکومت ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے اور یہ اسلام کا ایک جزو ہے۔"
آیت اللہ العظمیٰ علی منتظری کے افکار و نظریات پر مبنی کتاب "آثار و افکار" از مصطفیٰ ایزدی نجف آبادی مترجم حسن عباس فطرت میں تحریر ہے۔ اسلام جو ایک زندہ اور متحرک دین ہے۔ ایسا دین جو قیامت تک کے لوگوں کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس دین مقدس اسلام میں وہ قوانین موجود ہیں جو بغیر ایک حاکم کے عمل میں نہیں لائے جا سکتے اور تیسری بات یہ کہ اسلام میں مالی و اقتصادی مسائل ہیں۔ جہاد ہے اور اس بارے میں اسلام تصریح کرتا ہے کہ "جہاد بغیر امام کے نہیں ہو سکتا۔" امام یعنی حاکم، جہاد و مالیت کی وصولی و تحصیل، سزا و تعزیر سب اسلام کے جزو ہیں، مسائل ہیں اور ولایت و حکومت فقیہ سے مربوط ہیں۔"

حضرت آیت اللہ منتظری آگے فرماتے ہیں۔

"بعض لوگ اپنے ذہن میں یہ خیال بنائے ہوئے ہیں کہ ولایت کا مطلب اہل بیت کو دوست رکھنا ہے یعنی یہ کہ ہم اہل بیت کو دوست رکھیں۔ نہیں صاحبو! اس کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ ولایت کا مطلب حکومت سے ہے۔ اسلام کی بنا جن پانچ چیزوں پر ہے اس میں ایک حکومت بھی ہے۔"

اس دعویٰ کی دلیل بھی سنیئے۔

"امام محمد باقر سے پوچھا گیا کہ ان پانچ چیزوں میں فضیلت کس کی زیادہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ ولایت باقی چار چیزوں نماز، زکوۃ، روزہ اور حج سے افضل ہے۔ کیوں کہ ولایت ان سب کی کنجی ہے۔ والی و حاکم ان کی رہنمائی اور اجراء کرنے والا شخص ہے۔ لفظ والی سے سبھی مانوس و آگاہ ہیں اور عہد قدیم میں صوبوں اور علاقوں کو ولایت اور اس کے حاکم کو والی کہا جاتا تھا۔

"اسی طرح، ہمارے احادیث و روایات کی اصطلاح میں بھی ولایت کے معنی حکومت کے ہیں۔ مثلاً حضرت امیر المومنین کا وہ تاریخی عہد نامہ جو آپ نے مالک اشتر کے حوالے کیا تھا۔ اس وقت لکھا گیا جب آپؑ نے مالک اشتر کو مصر کی ولایت تفویض کی، اس عہد نامہ میں مالک کو والیٔ مصر کہا گیا ہے۔ لہذا ولایت اور حکومت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔"

امامت کی ضرورت

امامت، ولایت، حکومت کے مفہوم سے آگاہی کے بعد اس کی اہمیت اور ضرورت سے بھی واقفیت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ خمینی نے اپنی کتاب "الحکومت الاسلامیہ" میں اس تعلق سے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کو اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ کہ اسلام کی حکمرانی جاری و ساری رہنا چاہیئے۔ تمام مسلمان اس ضرورت پر متفق تھے۔ اختلاف جو کچھ تھا وہ یہ تھا کہ آنحضورؐ کے بعد حکومت کا سربراہ کون ہونا چاہیے۔"

محترم علامہ منتظری لکھتے ہیں۔

لوگوں پر جس طرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ واجب ہے بعینہ وہی حال حاکم کی اطاعت کا بھی ہے بلکہ یہ مسئلہ زیادہ اہم ہے مثلاً یہ کہ کوئی شخص یہ خیال کر کے خوش ہوئے کہ مجھے اصولِ دین از بر ہیں نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں حج بھی بجالاتا ہوں۔ اب جس کے جی میں آئے وہ لوگوں کے مقدر سے کھلواڑ کرے اور جو جی چاہے کرے ہمیں اس سے کیا لینا دینا تو یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔ غلطی ہے۔ ہم سے بھی لوگ کہتے ہیں کہ قاضی کا کام قاضی پر چھوڑ دیجیے اور قیصر کا قیصر پر ڈالیے "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اسلام کہتا ہے کہ جس طرح تم سے روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ کا سوال ہوگا۔ اسی طرح حاکم کا حق بھی تمہاری گردن پر ہے۔ اس لیے کہ اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم حق کی حکومت قائم کریں تاکہ حق جاری ہو سکے۔ اسلامی قوانین جاری ہو سکیں اور حد نافذ کی جا سکے۔"

امام کا تقرّر

حضرت آیت اللہ بروجردی نے اپنی ایک تحریر میں جسے محترم علی منتظری صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حکومت ضروریات اسلام میں سے ہے۔ اور (اسلامی) حکومت جزو اسلام ہے اہل سنّت کہتے ہیں کہ حکومت شوریٰ اور لوگوں کے انتخاب سے قائم ہوتی ہے (یعنی امام کا تقرر یا انتخاب تمام مسلمانوں کی رائے سے عمل میں آتا ہے) اور ہم شیعہ کہتے ہیں کہ حکومت (یعنی امامت یا تقرر امام) کے لیے پیغمبرؐ کی نص ضروری ہے اور وہ اس طرح کہ پیغمبرؐ اپنے بعد اس حاکم (امام) کا تعیّن کرتا ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہوتا ہے اس سلسلہ میں فریقین کے پاس احادیث متواتر موجود ہیں۔"

چنانچہ محترم محمد حسین آل کاشف الغطاء کہتے ہیں کہ سرکار کائنات نے "نص صریح" کے ذریعہ علی مرتضیٰ کو اپنا وصی بنایا۔ علیؑ نے حسن مجتبیٰؑ کو جانشین کیا۔ اور امام حسنؑ نے اپنے بھائی سید الشہداء امام حسینؑ کو یہ امامت سپرد کی۔ اسی طرح یہ سلسلہ گیارہویں امام تک پہنچ گیا۔ گیارہویں امام حسن عسکریؑ نے اپنے صاحبزادے بارہویں امام حضرت "مہدی منتظر" سلام اللہ علیہ کو صاحب الامر قرار دیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حکومت ضروریات اسلام میں سے ہے تو کیا آخری امام کی غیبت میں یہ ضرورت معطل رہے گی؟ عام شیعہ نقطہ نظر یہی تھا کہ اسلامی حکومت کا کام مہدی منتظر تک معطل رہے گا۔ لیکن ایران کے اسلامی انقلاب کے تمام قائدین کی رائے یہ ہے کہ ایسا کس طرح ممکن ہے جب اسلامی حدود معطل ہیں۔ قوانین اسلامی میں تبدیلی کی جارہی ہے یا ان کو ختم کیا جارہا ہے۔ طبقاتی فرق بڑھتا جارہا ہے۔ ظلم وجبر کا بول بالا ہے۔ غریب عوام ہر طرح کے استحصال کا شکار ہورہے ہیں۔ لہذا محترم علامہ خمینی رہبر انقلاب اسلامی ایران کا کہنا ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کو اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ اسلام کی حکمرانی جاری و ساری رہنا چاہیئے۔ تمام مسلمان اس ضرورت پر متفق تھے اختلاف جو تھا وہ یہ تھا کہ آنحضور کے بعد حکومت کا سربراہ ہونا چاہیے۔ آنحضورؐ کے بعد اور پھر امیرالمومنین علیؑ کے زمانہ میں اسلامی حکومت اپنے تمام اداروں کے ساتھ موجود رہی۔ اس بارے میں ہمیں کسی شک میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے۔"

محترم علامہ علی منتظری صاحب کا اس سلسلہ میں کہنا ہے کہ علما اور رہبران دین کو اس مسئلہ میں آگے آنا چاہیے اور دوسروں کو ان کی پیروی کرنا چاہیے۔ امیرالمومنین نے فرمایا ہے کہ خدا نے علما سے عہد لیا ہے کہ اگر ظالم ظلم کر رہا ہو اور کمزور لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہوں تو وہ خاموش تماشائی نہیں بنے رہیں گے۔ تاریخ طبری اور دوسری کتابوں میں سیدالشہدائے مورخین نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھے کہ وہ ظلم کر رہا ہے۔ حلال خدا کو حرام اور حرام خدا کو حلال کر رہا ہے تو اس کا فرض ہے کہ اس کا دامن پکڑے اور ٹوک دے۔"

چنانچہ محترم علی منتظری صاحب کہتے ہیں۔

"پیغمبرؐ کے تعین کے تحت تو مسلمانوں کے حاکم بارہ ہیں۔ لیکن ان حاکموں اور ائمہ نے خود اپنے زمانے میں مصر و ایران اور دیگر مقامات پر دوسرے لوگوں کو امام مقرر کیا۔ یہ لوگ معصوم نہیں تھے۔ لیکن اُمت میں جو صالح ترین افراد تھے۔ اُن میں سے انتخاب کیا گیا تھا۔ لہٰذا

انھوں نے جس طرح اپنے عہد میں کیا۔ زمانہ غیبت کے لیے بھی وہ یہ اصول چھوڑ گئے ہیں۔"

غرض روحانی امامت کا حق تو ان متعین بارہ ۱۲ اماموں کو ہی رہے گا۔ لیکن ضرورت اور مصالح کے پیش نظر نائب امام کی حیثیت سے ایک عادل اور خدا کے احکام کو جاری کرنے والا شخص بھی عنانِ حکومت سنبھال سکتا ہے

اس طرح اس روحانی اور عملی امامت کے نظریہ نے تاریخ اسلام کا ایک انتہائی اہم مسئلہ بھی حل کر دیا ہے۔ اسلامی انقلاب ایران کے ایک مفکر ڈاکٹر علی شریعتی کا کہنا ہے کہ روحانی امامت تو ہم امیر المومنین علی مرتضیٰؑ کی تسلیم کریں گے۔ البتہ ایک واقعہ کے طور پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ مسلمانوں کے امام تھے۔

نبوّت اور امامت

حضرت علامّہ علی منتظری صاحب کا کہنا ہے کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے۔

"جس وقت اللہ نے ابراہیم کو آزمایا اور وہ پورے اُترے تو اُن سے کہا کہ میں تم کو امام بنانا ہوں۔"

ابراہیم پیغمبر تھے۔ امام تھے (اس اعتبار سے) امامت کا مقام نبوت سے اہم تر ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دونوں منصب حاصل تھے۔"

دوسرے معنی میں یہ وہی بات ہوئی جو اہل سنّت علماء کہتے ہیں کہ رسالت نبوت سے افضل ہے۔ اور وہ اس لیے کہ رسالت شریعت سے وابستہ ہے۔ رسول اپنے ساتھ تازہ شریعت لے کر آتا ہے جب کہ نبی کسی سابق رسول کی شریعت کا پیروکار ہوتا ہے۔

لیکن وہ امام جو نبی نہ ہو اور رسول کا وصی ہو۔ اس کی امامت یقینی طور سے ایک مقام بلند کی حامل ہو سکتی ہے۔ مگر منصب رسالت کا اپنا مقام جس کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ حضرت علامّہ علی منتظری صاحب کہتے ہیں۔

"یہ نہ کہیے کہ پیغمبر اور ائمہ کی شان حکومت کے عہدے سے بلند ہے بلکہ پیغمبر اور ائمہ کے مدارج

عالیہ ہیں اور وہ معنوی ہیں جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ بتائیے کون پیغمبر کا مثل ہو سکتا ہے اور کون علیؑ کے مقام معنوی کو پا سکتا ہے۔"

اس سلسلہ میں مزید وضاحت علامہ محمد حسین آل کاشف الغطاءؒ کے ان الفاظ سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"نبی اور امام میں فرق یہ ہے کہ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور امام خصوصی توفیق کے ساتھ رسول سے احکام حاصل کرتا ہے۔"

"پس رسول خدا کا پیغام رساں ہے اور امام رسول کا پیغام رساں ہے۔ (اس طرح) امام کمالات و مرتبہ میں نبی سے کم اور عام مخلوق سے بہت بلند ہوتا ہے۔"

سید العلماء سید علی نقی صاحب مسئلہ امامت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ایمان و معرفت باری تعالیٰ کے مدارج و مراتب ہیں اور ہر ایک کی کچھ خصوصیات و نتائج ہیں اور بلند ترین درجہ نبی و رسول کا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اُس کو منجانب اللہ تبارک و تعالیٰ پیشوائی خلق حاصل ہوتی ہے اور اس پیشوائی خلق کا کسی دوسرے کی طرف منتقل ہونا وصایت و خلافت اور جانشینی و امامت ہے۔"

عصمتِ امام

امام کے تعلق سے عصمت کا لفظ سامنے آتے ہی یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ عصمت اور معصومیت کا تعلق تو صرف نبی یا رسول کی ذات اقدس سے ہوتا ہے۔ ایک غیر نبی سے چاہے وہ امام کیوں نہ ہو، عصمت کی وابستگی کچھ عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم الفاظ کی بحث میں نہ پڑیں تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہے کہ شیعہ علماء عصمت امام سے مراد وہ قطعی نہیں لیتے ہیں جو عصمت انبیاء سے مراد ہے۔

چنانچہ نبوت کے باب میں علامہ کاشف الغطاءؒ لکھتے ہیں۔

"آپؐ بالکل معصوم تھے۔ نہ کوئی گناہ سرزد ہوا نہ لغزش! زندگی بھر حضور اکرمؐ مرضیٔ حق کے مطابق عمل کرتے رہے۔"

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کوئی خطا سرزد نہ ہوئی اور آپؐ بالکل معصوم تھے لیکن امام کے معصوم ہونے کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے۔

علامہ سید علی نقی صاحب اپنی کتاب "ابوالائمہ کے تعلیمات" میں عصمت امام کے تحت لکھتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ

"میں اپنے نفس کے لحاظ سے اس سے بالاتر نہیں ہوں کہ غلطی کروں اور نہ مجھے اپنے فعل سے اس کا اطمینان ہو سکتا ہے۔ مگر یہ کہ خدا میرے نفسانی تقاضے کو میرے قابو میں رکھے جس پر وہ مجھ سے زیادہ قادر ہے۔"

علامہ موصوف نے اپنی ایک دوسری کتاب "امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن" میں عصمت امام کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے۔

ہم نے تم کو اُمت وسط یعنی اپنے اخلاق و اوصاف میں حد "اعتدال" پر قائم رہنے والی جماعت قرار دیا تاکہ تم لوگوں کے اعمال کے گواہ ہو اور رسول سب کے اوپر گواہ۔"

مولانا محترم قرآن کی اس آیت پر نوٹ لکھتے ہیں۔ اس کے (اعتدال) کے حقیقی معنی سوائے معصوم کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔

ائمہ اثنا عشرہ کا ثبوت

حضرت مولانا سید علی نقی صاحب نے ائمہ اثنا عشر کے وجوب کی وضاحت کے لیے بعنوان "امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن"، مکمل ایک کتابچہ ترتیب دیا ہے۔ اس کتابچہ میں مولانا موصوف نے قرآن پاک کی آیات سے بطور دلیل اپنے مقصد کی وضاحت کی ہے۔

ذیلی عنوانات کے تحت انھوں نے قرآن مجید کے طرز بیان، انبیائے سابقہ کے واقعات اور اُن کا مقصد، رسالت مآبؐ حضرت مثیل حضرت موسیٰ تھے توریت و انجیل، قرآن کے مطابق، حضرت موسیٰ کی قوم میں ائمہ کا خدا کی طرف سے تقرر، قوم حضرت موسیٰ کے نقباء (سرداروں) کی

تعداد، حضرت موسیٰ کے جانشین اُن کے بھائی ہارون اور چند دوسرے عنوانات سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اس سبب سے حضور اکرمؐ کے حضرت علیؓ کے لیے جانشین ہونے کا مسلک درست ہے۔ اور اسی طرح اُمت محمدی میں خدا کی جانب سے بارہ اماموں کا تقرر مبنی برحق ہے۔

مولانا موصوف آیات قرآنی۔ ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل ___ "فقد ضلّ سوآء السبیل" پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس میں خداوند عالم نے اس بات کا اعلان فرمایا ہے کہ قوم موسیٰ میں نقباء کی تعداد بارہ ۱۲ تھی اور یہ کہ بنی اسرائیل سے اُن کی اتباع اور پیروی کا عہد لیا گیا اور اُن کی تائید و تقویت پر جنّت کا وعدہ اور مخالفت کی صورت میں ہلاکت کا پیغام دیا گیا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح قرآن مجید نے نقباء کی تعداد بارہ ۱۲ بتا کر کسی خاص حقیقت کی طرف رہنمائی کی ہے توریت نے صریحی طور پر اولاد اسماعیل میں بارہ ۱۲ امام ہونے کی خبر دی ہے۔ (حضرت ابراہیم سے خطاب کرتے ہوئے)

اور میں نے اُس کے حق میں تیری بات سنی۔ دیکھ اب میں اُسے برکت دوں گا اور اس کو بار آور کروں گا اور بہت افزائش دوں گا اور اُس سے بارہ ۱۲ رئیس پیدا ہوں گے اور میں اُس کو بڑی قوم بناؤں گا۔"

(سفر تکوین باب ۱۷ آیت ۲۰)

اب ہم کسی باعث اس بات کو بھلے ہی تسلیم نہ کریں لیکن شیعہ حضرات اپنے مسلک کے لیے ایک مضبوط دلیل ضرور رکھتے ہیں۔

"ہمارے امامیہ برادران باوجودیہ کہ وہ بعض مسائل میں
اختلافات رکھتے ہیں لیکن قرآن کے بارے میں ان کا وہی
نظریہ ہے جو ہر مومن کا ہے۔"

(الامام الصادق۔ از: امام ابوزہرہ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیعہ فرقہ ایک اسلامی فرقہ
ہے۔ اگرچہ فرقہ سبائیہ کو جو حضرت علی کو اللہ سمجھتا ہے ہم نے
خارج از اسلام قرار دیا ہے، لیکن شیعہ تو مسلمان فرقوں میں
شامل ہے۔ نیز ہم سب جانتے ہیں کہ شیعہ اثنا عشریہ بھی سبائیہ
کو کافر سمجھتے ہیں۔ ابن سبا بھی ایک موہومی شخصیت تھی۔
اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شیعہ جو کچھ کہتے ہیں وہ قرآنی
نصوص اور احادیث نبوی کی رو سے کہتے ہیں۔"

("تاریخ المذاہب الاسلامیہ" از: امام ابوزہرہ)

تحریفِ قرآن

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نوع انسان کو اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ جن کا مکمل ادراک بہت دشوار ہے اور ان بے شمار نعمتوں میں سب سے عظیم اور اعلیٰ مقصد کی حامل نعمت جو رب العالمین کی جانب سے نسل انسانی کو عطا کی گئی ہے۔ وہ ہے اللہ کی آخری اور مکمل کتاب قرآن پاک جو انسانیت کے لیے سراسر ہدایت اور مکمل رہنمائی کی حامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم نعمت آج ہمارے پاس ایک کتاب کی صورت میں موجود اور محفوظ ہے۔ یہی ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ لیکن غیر مسلموں کا معاملہ تو الگ رہا۔ خود مسلمانوں کے مختلف گروہ اور فرقے ایک دوسرے پر تحریف قرآن کا الزام عائد کرتے ہیں۔ سنیوں کا کہنا ہے کہ شیعہ قرآن پاک میں تحریف کے قائل ہیں شیعہ کہتے ہیں کہ سنی قرآن میں تحریف کو مانتے ہیں اور دونوں جانب بہت سے دلائل ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان معاندانہ کلامی بحثوں سے الگ کوئی بھی مسلمان سنی اور شیعہ قرآن پاک میں اصولی طور پر تحریف کا قائل نہیں ہے۔

لیکن ہم اہل سنت کے سامنے یہ بات اتنے تواتر اور تسلسل سے آتی رہی ہے کہ شیعہ قرآن پاک میں تحریف کے قائل ہیں اس لیے اس کا انکار مفصل گفتگو کیے بغیر آسان نہیں معلوم ہوتا، اس وجہ سے میں اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کر رہا ہوں۔

اس تعلق سے میرے مطالعہ میں متعدد کتابیں آئی ہیں کہ جس کے باعث میں نے محسوس کیا کہ جو جیّد شیعہ علماء قرآن پاک کے سلسلہ میں یہ عظیم احساس رکھتے ہیں کہ قرآن مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور جس کی موجودگی میں قیامت تک اب کسی اور آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں ہے وہ بھلا قرآن میں تحریف کے کیسے قائل ہو سکتے ہیں۔

عظمتِ قرآن مجید

چنانچہ رئیس الشیعہ علامہ سید علی الحائری مجتہد العصر والزماں اپنی معرکتہ الآرا تقریر بعنوان "موعظ تحریف قرآن" کے تحت فرماتے ہیں۔

"یہی وہ جامع العلوم قانون الٰہی ہے جس کے بعد قیامت تک کسی اور آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔ قرآن پاک کی سب سے بڑی عزت اور عظمت اس میں نہیں ہے کہ اس کو زربفت اور ریشمی عمدہ رومالوں اور غلافوں میں مضبوط گرہیں لگا کر بلند طاقوں پر رکھ دیا جائے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ قرآن کی سچی اور واقعی تعظیم و تکریم حقیقتاً یہی ہے کہ سمجھ کر اس کی روزانہ تلاوت کی جائے اور اس کے احکام، اوامر و نواہی کی تعمیل کو فرض عین سمجھ لیا جائے۔ فی الواقع ہر مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ قرآنی علم و عمل میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ حسنہ حاصل کرے۔"

"اس مقدس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں دنیا کی کوئی کتاب اس کی مثل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور یہ بات کہ جو انقلاب اس کتاب نے برپا کیا اس کی بھی کوئی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ حقیقت سب پر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ جو تمام نبیوں سے اور تمام مذہبی مصلحین سے بڑھ کر کامیاب ہوئے تو یہ کامیابی اسی پاک کتاب قرآن کے ذریعے وقوع میں آئی۔"

"ایک غائر نظر ڈالو دیکھو قرآن کا ایک ایک لفظ اللہ تعالیٰ کی عظمت و شوکت کا ایک ایسا موثر نقشہ کھینچتا ہے۔ جس کی نظر ہمیں کسی دوسری مقدس کتاب میں نہیں ملتی اور اسی طرح قرآن یہ تحدی کرتا ہے۔ "اس جیسی ایک ہی سورہ پیدا کر دو" جس کا جواب دنیا میں نہیں ہو سکا۔

اسی قرآن کی تعلیم نے اپنے اولین ماننے والوں کو جو قعر مذلت میں ڈوبے ہوئے تھے اور جن پر جہالت اور تاریکی کے بادل پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ ایک خدا پرست راستباز انسانوں کی جماعت بنا کر دنیا کی اصلاح کے لیے کھڑا کر دیا۔ اور انھوں نے دوسروں میں بھی وہی روح پھونک دی جو قرآنی تعلیم کے مطابق خود اُن کے اندر کام کر رہی تھی۔ قرآن سے متعلق شیعوں کا یہی عقیدہ ہے۔"

قرآن مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے

اس عنوان کے تحت سید العلماء الحاج سیّد علی نقی النقوی صاحب اپنی کتاب "تحریف قرآن کی حقیقت" میں لکھتے ہیں۔

"دنیا تہی دست ہے جب کہ اُس کے پاس قرآن کے مثل کوئی کتاب نہیں۔ لیکن مسلمان قرآن کی بدولت اُس خزانہ عامرہ کے مالک ہیں جن کی نظیر صفحہ روزگار میں نہیں مل سکتی۔"

"تباہ ہو جائیں سابقہ اسلامی حکومتیں اور مٹ جائے اُن کا جاہ و جلال، لیکن جب مسلمانوں کے ہاتھوں میں قرآن موجود ہے۔ وہ دنیا کی اقوام میں سربلندی کے مالک ہیں۔ حقانیت اور صداقت کا علم اُن کے سر پر لہرا رہا ہے۔"

سید العلماء آگے لکھتے ہیں۔

"قرآن جس طرح اپنی فصاحت و بلاغت کے لیے عرب مشرکین کے لیے معجزہ تھا جو اس قلمرو میں خداوندی کے مدعی تھے۔ اسی طرح وہ اپنے حقائق و اسرار کی حیثیت سے بھی معجزہ ہے۔

اس کی آیتوں میں وہ بیش بہا جوہر نظر آتے ہیں۔ اس میں علوم و فنون کے وہ اسرار و حقائق مندرج ملتے ہیں کہ جن کو سالہا سال کی تحقیقات کے بعد معلوم کرنا سرمایہ افتخار سمجھا گیا ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ تمام فلاسفۂ دنیا، تمام علوم و فنون کے ماہر، تمام تمدن و اخلاق و علم النفس و سیاست و اجتماع اور مذاہب و ادیان کے راہنما اس کی ایک ایک سطر، ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک حرف کو دیکھیں اور پڑھیں اور اس میں غور کریں یقیناً غلط فریبی کے پردے جو آنکھوں پر پڑے ہوئے ہیں اُٹھ جائیں گے۔ قرآن کی حقانیت آفتاب عالم تاب بن کر چمکے گی اور دنیا کو اپنا حلقہ بگوش بنالے گی۔ یہ ہے قرآن کہ جو مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ اور اسلام کا خزانہ عامرہ ہے۔"

کیا اب بھی یہ شک باقی رہتا ہے کہ شیعہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے اور اس میں تحریف کے قائل ہیں۔؟"

لیکن ابھی نہیں اور آگے چلیں۔

شیعہ مسلمان قطعاً تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں !

علامہ سیّد علی الحائری صاحب عنوان بالا کے تحت فرماتے ہیں۔

"شیعہ موجودہ قرآن کو منزل من اللہ غیر محرّف مانتے ہیں۔ جو شخص قرآن میں کمی یا زیادتی کا ہونا ہماری طرف نسبت کرتا ہے وہ کاذب اور مفتر کی ہے۔ تمام اصولی شیعوں کا یہی اعتقاد ہے۔ میں آپنے اس اعتقاد کے ثبوت میں اکابر مجتہدین عظام کی تصدیق پیش کرتا ہوں۔ لہٰذا ہم شیعوں کا قیامت تک کے لیے یہی ناقابل تغیّر صحیح عقیدہ اور عمل ہے۔"

اس کے بعد علامہ موصوف نے اپنے اکابر مجتہدین کی بہت سی شہادتیں پیش کی ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

پہلی گواہی

علامہ موصوف بیان کرتے ہیں کہ حضرت علامہ شیخ صدوقؒ کے رسالۂ اعتقادات میں جو مسلمہ طور پر تمام شیعی دنیا میں اعتقادات صحیحہ کے لیے مشہور ہے۔ شیعوں کے عقیدہ قرآن مجید کے متعلق یوں مرقوم ہیں۔

ہم شیعوں کا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن مجید جس کو خدا نے اپنے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کیا ہے اور جو اس وقت لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس سے زیادہ نہیں تھا۔

لہٰذا جو شخص ہم شیعوں کی طرف یہ نسبت کرے کہ ہم شیعہ کہتے ہیں کہ قرآن موجودہ مقدار سے زیادہ تھا۔ وہ جھوٹا، کذاب اور مفتر کا ہے۔"

دوسری گواہی

تفسیر "مجمع البیان" جلد اوّل میں علامہ طبرسیؒ لکھتے ہیں۔ قرآن میں زیاتی کا واقع ہونا تو بالاجماع باطل اور غلط ہے۔ لیکن کمی واقع ہونے میں صرف چند شیعہ اور فرقہ حشویہ نے روایت کیا کیا ہے کہ قرآن میں تغیّر اور نقصان واقع ہوا ہے لیکن ہمارے مذہب شیعہ کا عقیدہ اس کے خلاف

ہے یعنی قرآن میں کمی بھی واقع نہیں ہوئی جس طرح کہ قرآن میں زیادتی واقع نہیں ہوئی ہے۔ علم الہدیٰ سید مرتضیٰؒ نے بھی اسی عقیدہ کی تائید کی ہے اور فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہی قرآن جمع کر لیا گیا تھا۔ اسی موجودہ صورت میں جیسا کہ وہ اب ہے۔"

تیسری گواہی

"قوانین الاصول" مطبوعہ ایران جلد اوّل باب ۶ میں "بحث کتاب" کے تحت علامہ مرزا ابوالقاسمؒ لکھتے ہیں۔

"علم الہدیٰ سیّد مرتضیٰ، علامہ صدوق، محمد بن بابویہ، محقق طبرسی، محمد ابن الفضل اور تمام جمہور مجتہدین شیعہ عدم تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ البتہ چند اخباریوں کے نزدیک قرآن میں تحریف زیادتی اور کمی واقع ہوئی ہے۔

لیکن ان اخباریوں کے سلسلہ میں علامہ طبرسی کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ضعیف حدیثوں کو صحیح سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ ضعیف حدیثوں کی بنیاد پر کسی صحیح اور یقینی الثبوت امر کو بدلا نہیں جا سکتا۔"

چوتھی گواہی

"کتاب البیان" میں علامہ شیخ الطائفہ محمد بن الحسن طوسیؒ لکھتے ہیں۔

"قرآن کی زیادتی اور کمی میں کلام کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن کی زیادتی کے بطلان پر تو اجماع قائم ہے۔ رہا کمی کا واقع ہونا تو پس اس میں ظاہر یہ ہے کہ مسلمانوں (شیعوں) کا مذہب قطعاً اس کے خلاف ہے۔"

اکابر شیعہ علماء کی ان واضح شہادتوں کے بعد تحریف قرآن کا مسئلہ بالکل صاف اور عیاں ہو جاتا ہے اور اب مزید کسی بیان کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن علامہ سید علی المحائری صاحب کہتے ہیں کہ خاکسار بھی تمام مجتہدین شیعہ کی طرح یہی اعتقاد رکھتا ہے کہ موجودہ قرآن جو اس وقت ہم سب کے ہاتھوں میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر منزل من اللہ، ہر حیثیت سے کامل و اکمل واجب التعظیم اور مفترض العمل ہے۔

اب ہماری تسلّی ہو جانا چاہیے اور اب ہم اس خیال خام سے اپنے ذہن کو پاک وصاف کرلیں کہ شیعہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔ لیکن ابھی خاطر خواہ تسلّی نہیں ہوئی ہو اور برسوں سے ذہن پر پڑی ہوئی گرد کی کچھ تہیں ابھی باقی ہوں تو آیئے، اس موضوع پر اور کچھ گفتگو کریں۔

سیّد العلماء الحاج مولانا السیّد علی نقی النقوی صاحب نے اپنی کتاب "تحریف قرآن کی حقیقت" کے آخر میں مزید سندیں فراہم کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"علماء شیعہ وحفاظ ملّت کے مستند کتب واحادیث وجوامع اخبار میں ایسی احادیث کا بڑا ذخیرہ ہے۔ جن سے موجودہ قرآن مجید کا اعتبار واستناد اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا اعتقاد اور اس پر عمل کا واجب ولازم ہونا یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے۔"

ایک بڑے ذخیرے میں سے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

موجودہ قرآن اور حضرت علیؓ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشادات کے مجموعہ کے طور پر شیعوں میں نہج البلاغہ کو ایک بلند اور باعظمت مقام حاصل ہے اور اس کے حوالے سے حضرت علیؓ کے ارشادات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ نہج البلاغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۷۰ پر موجودہ قرآن کے متعلق حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

"کتاب الٰہی تمہارے اندر موجود ہے۔ وہ ایسا خطیب ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں اور ایسا محکم قلعہ ہے جس کے ستون منہدم ہونے والے نہیں اور ایسا نقطۂ عزت ہے جس کے طرف دار شکست کھانے والے نہیں۔"

مزید ارشاد فرمایا۔

"یقین جانو کہ یہ قرآن وہ ناصح ہے جو دھوکا نہ دے اور وہ راہنما ہے جو کبھی گمراہ نہ کرے اور وہ بات کرنے والا ہے جو کبھی کذب بیانی نہ کرے۔ یقین جانو کہ قرآن کے ساتھ کسی کو احتیاج باقی نہیں رہ سکتی اور قرآن کے بغیر استغنار ناممکن ہے اس کو تم اپنے امراض کے لیے ذریعہ شفا اور اپنی مصیبت کے وقت پر مددگار قرار دو اس لیے کہ اس میں سب سے بڑے مرض کے لیے شفا موجود ہے جس کا نام

ہے کفر و نفاق اور کور باطنی و گمراہی۔ خدا سے اس قرآن کے ذریعہ سوال کرو اور اسی کی محبت کے ساتھ اس کی بارگاہ کی طرف رخ کرو۔ لیکن اس قرآن کو مخلوق کے پاس رشوت کا ذریعہ نہ بناؤ بے شک خدا کی بارگاہ میں اس سے بڑھ کر کوئی وسیلہ نہیں۔ یقین جانو کہ یہ قرآن شفاعت کرنے والا ہے اور اسکی شفاعت قبول کی جانے والی ہے جس کی سفارش روز قیامت قرآن کر دے گا۔ اس کے متعلق سفارش منظور ہوگی اور جس کی شکایت روز قیامت قرآن کر دے گا تو اس کے خلاف اس کی شکایت قابل قبول ہوگی۔۔۔ اس قرآن کو اپنے رب کی جانب اپنا راہنما قرار دو اپنے نفسوں کے خلاف اُس کی نصیحتوں کو قبول کرو اور اُس کے مطالب میں خود اپنے ذاتی خیالات پر بے اعتمادی کرو اور اپنی خواہشات نفس کو خود فریبی سمجھو۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ان ارشادات کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ شیعہ حضرات کے لیے موجودہ قرآن پاک کس اہمیت اور عظمت کا حامل ہے۔

قرآن معیار حق ہے

شیعہ حضرات موجودہ قرآن پاک کا نہ صرف اعتبار کرتے ہیں۔ اُس کے کلام الٰہی ہونے پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اُس پر عمل کو واجب و لازم قرار دیتے ہیں بلکہ قرآن پاک کو احادیث کی صحت کا معیار بھی تسلیم کرتے ہیں۔

چنانچہ سید العلماء نے اس ذیل میں متعدد احادیث نقل کی ہیں۔

"امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا۔ ہر حق کے لیے حقیقت نما علامات ہیں اور ہر واقفیت کے لیے روشنی ہے تو جو چیز کتاب اللہ کے موافق ہو اس کو لے لو اور جو چیز کتاب اللہ کے خلاف ہو اس کو ترک کر دو۔"

"امام جعفر صادق کا ارشاد ہے کہ ہر شے کتاب و سنت کی طرف راجع ہونا چاہیے۔ اور جو حدیث کتاب اللہ کے موافق نہ ہو وہ بناوٹی ہے۔"

"امام جعفر صادقؒ کہتے ہیں کہ رسالت مآبؐ نے منیٰ میں خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ جو حدیث تمہارے سامنے ایسی پیش ہو کہ وہ کتاب اللہ کے موافق ہو تو وہ میرا قول ہوگا اور جو حدیث

ایسی آئے کہ وہ کتاب اللہ کے مخالف ہے۔ اس کو سمجھنا کہ میں نے نہیں کہا ہے۔"

مندرجہ بالا احادیث نقل کرنے کے بعد سید العلماء نے لکھا ہے۔ اس طرح کی اور بھی بہت احادیث ہیں اور اُن سب کا متفقہ مضمون یہی ہے کہ قرآن پاک احادیث کی صحت کا معیار ہے۔ اب اگر یہ قرآن پاک کہ جو مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔ ائمہ معصومین کے نزدیک مصدّق اور تسلیم شدہ نہیں ہوتا تو پھر اس کو احادیث کی صحت کا قرار دینا صحیح نہ ہوتا۔ ان میں سے وہ احادیث کہ جو جناب رسالت مآبؐ سے منقول ہیں۔ ان کو بھی چوں کہ ائمہ اہلسنت نے معیار بتلاتے ہوئے نقل کیا ہے۔ اس لیے اُن کی تطبیق بھی اسی قرآن پر ہے کہ جو عام ہاتھوں میں موجود ہے۔"

ایسے ہی متعدد احادیث کی سند کے ساتھ سید العلماء نے مزید لکھا ہے کہ قرآن کی مخالفت کفر ہے، قرآن نشان ہدایت ہے اور قرآن جنت کا راہنما اور جہنم سے سدّراہ ہے۔ اور فقہا کی کتابوں کے حوالے سے۔ خط مصحف کو بغیر طہارت چھونا جائز نہیں۔ موجودہ قرآن کے علاوہ کسی جزو کو بہ حیثیت قرآن نماز میں پڑھنا حرام۔ نجاست کا قرآن تک پہنچنا گناہ کبیرہ، احادیث میں جو قرآن کے خلاف ہو وہ مسترد۔"

اور لیجئے، کتاب کے بالکل آخر میں۔ "تمام بحث کا آخری نتیجہ یا میرا عقیدہ" کے عنوان کے تحت محترم سید العلماء علامہ علی نقی صاحب نے تحریر کیا ہے۔

"موجودہ قرآن کلام الٰہی، وحی آسمانی، رسول کا اعجاز اور مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہے۔ اس کے کسی جزو یا کل کی مخالفت، مخالفت خدا ہے اور اس کا اتباع ہر مسلمان کا رکن مذہب اور اہم ترین فریضہ ہے۔ موجودہ قرآن کے علاوہ کسی سورہ کسی آیت کسی حرف کا بھی جزو قرآن ہونا ثابت نہیں اور نہ اس پر احکام قرآن مرتب ہو سکتے ہیں۔ واللہ یحق الحق بکلماتہ۔"

اب ساری حقیقت عیاں ہو کر سامنے آگئی کہ شیعہ حضرات موجودہ قرآن کو ہر پہلو سے معتبر مانتے ہیں اور تحریف قرآن کے قطعاً قائل نہیں ہیں۔ لیکن ایک سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ تحریف قرآن کا قائل ہونا شیعوں پر محض ایک الزام ایک تہمت ہے تو پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تعلق سے یہ چالیس پاروں کی بات کہاں سے آئی۔؟

آیئے، چلتے چلتے اس غلط فہمی کو بھی دور کر لیں۔

حضرت علیؓ کے قرآن کی حقیقت

علامہ سید علی المحائری صاحب "قوائین الاصول" مطبوعہ ایران جلد اوّل کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

حضرت علامہ صدوقؒ کا کلام قرآن علیؓ کے متعلق یہ ہے کہ حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ نے جو قرآن جمع کیا تھا اس میں جو زیاتی ہے وہ اس کے سوا کسی اور قرآن میں نہیں ہے۔ وہ زیادتی نفس قرآن میں نہیں تھی بلکہ اس میں احادیث قدسیہ بھی جمع لی گئی تھیں۔"

یعنی صحیفہ حضرت علیؓ میں بھی اصل قرآن اسی قدر تھا جو اس وقت مسلمانوں کے درمیان موجود ہے اور اس میں اضافہ صرف احادیث قدسیہ کا تھا لیکن علامہ موصوف کہتے ہیں۔ "نادانوں نے کچھ کا کچھ مشہور کر دیا۔"

آخری بات

شیعہ حضرات نے تحریف قرآن کے سلسلہ میں بڑی شد و مد کے ساتھ اپنی برارت کا اظہار کیا ہی ہے جس کی خاصی تفصیل ہمارے سامنے آچکی ہے اور جس کے سبب ہم صحیح صورت حال سے پور کی طرح واقف ہو چکے ہیں کہ شیعوں پر محض یہ ایک الزام اور ایک تہمت ہی ہے کہ وہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔ اسی کے ساتھ حق پسند شیعہ علماء نے بعض شیعوں کی جانب سے لگائے گئے اس الزام کو بھی ردّ کیا ہے کہ شیعہ تو نہیں لیکن اہلسنّت اور اُن کے خلفاء راشدین یقیناً قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔

محترم آیت اللہ سید ابوالقاسم الموسوی الخوئی اپنی کتاب "شاخسانۂ تحریف" میں۔ "کیا خلفاء کے ہاتھوں تحریف ہوئی" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

قائلین تحریف بسلسلہ تحریف تین۳ باتیں کہہ سکتے ہیں

۱۔ یہ تحریف بعد پیغمبرؐ اسلام شیخین کے ہاتھوں ہوئی

۲۔ یہ تحریف حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں اس وقت ہوئی جب مصاحف کا جھگڑا اُٹھا تھا۔
۳۔ کسی ایسے شخص کے ہاتھوں ہوئی جو خلافت کے دور اوّل کے بعد تحریف کا سبب بنا ہو۔

یہ تمام دعوے نہایت لغو اور مہمل ہیں۔

پہلا دعویٰ کہ تحریف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے واقع ہوئی ہے۔ اس کو باطل سمجھا جائے گا۔ کیوں کہ یہ تحریف یا تو انھوں نے جان بوجھ کر کی ہے یا لاعلمی میں ہوئی ہے؟ لاعلمی میں یوں ہوگئی ہو کہ اُن تک وہ تمام اجزاء قرآنیہ جمع قرآن کے وقت پہنچے ہی نہ ہونگے۔ اور اگر یہ تحریف انھوں نے عمداً کی ہے تو اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ انھیں آیات میں انھوں نے تحریف کی ہوگی جن کی بنا پر اُن کی زعامت پر اثر پڑ سکتا ہو۔
۲۔ ان آیات میں تحریف کی ہو جن کا اُن کی زعامت اور خلافت سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں تین احتمالات کا تصور ہو سکتا ہے۔

۱۔ یہ احتمال کہ پورا قرآن اُن تک پہنچا ہی نہیں۔ یہ نہایت لغو احتمال ہے کیوں کہ پیغمبر اسلامؐ نے جو اہتمام حفظ قرآن کے سلسلہ میں فرمایا تھا۔ وہ پوری طرح واضح ہے.... (لہٰذا) اصحاب رسولؐ کے پاس قرآن محفوظ تھا۔ چاہے وہ یکجا رہا ہو یا الگ الگ رہا ہو لیکن تھا محفوظ! (اور اسی طرح) اب چاہے وہ سینوں میں محفوظ رہا ہو یا صفحۂ قرطاس پر۔ بہر حال محفوظ تھا۔

۲۔ شیخین نے قرآن میں عمداً تحریف کی ہو اور ان آیات میں تحریف کی ہو جن کا تعلق اُن کی حاکمیت سے نہ تھا۔ یا اُن کے اصحاب کی زعامت سے ان آیات کا کوئی واسطہ نہ تھا۔

یہ احتمال بنفسہٖ قرین عقل نہیں ہے۔ بھلا اس سے انھیں کیا فائدہ تھا اور اس سے اُن کی کونسی غرض وابستہ تھی۔ لہٰذا ان کے ہاتھوں تحریف کا کیسے قائل ہوا جا سکتا ہے۔

۳۔ یہ احتمال کہ شیخین نے عمداً ان آیات میں تحریف کی ہے جو اُن کی ریاست اور سیاست سے متعلق تھیں۔ یہ بھی مہمل ہے اس لیے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔

دوسرا دعویٰ کہ تحریف دور خلافت عثمانی میں ہوئی ہوگی۔ یہ بھی مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قرین عقل نہیں ہے۔

۱۔ دور خلافت عثمانی تک اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی قرآن میں کمی د

بیشی کر سکے۔

۲۔ اگر ان آیات میں تحریف ہوئی جن کا تعلق ولایت اور حکومت وزعامت سے نہ تھا تو بلا سبب تحریف کی کوئی تک نہیں۔ اور اگر یہ تحریف ان آیات میں ہوئی جن کا کچھ بھی تعلق مسئلہ خلافت سے تھا تو اُس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

۳۔ اگر حضرت عثمانؓ محرّف قرآن ہوتے تو قاتلین کے لیے واضح ترین دلیل وحجّت تحریف قرآن ہی قرار پاتی۔ لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔

۴۔ اگر دور خلافت عثمانی میں قرآن میں تحریف ہوئی تھی تو امیرالمومنین حضرت علیؓ کے لیے ضروری تھا اور ان پر واجب تھا کہ وہ اپنے زمانے میں قرآن کو پھر اپنی اصلی حالت میں لے آتے اور مسلمانوں کو وہ قرآن دیتے جو پیغمبر اسلام کے وقت میں تھا اور جس کی تلاوت شیخین کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ اور یہ کوئی قابل اعتراض بات بھی نہ تھی لیکن آپ کا سکوت موجودہ قرآن کے عدم تحریف پر روشن دلیل ہے۔

تیسرا یہ دعویٰ کہ تحریف خلفاء راشدین کے بعد واقع ہوئی۔ اس کا آج تک کسی نے دعویٰ نہیں کیا۔

غرض تحریف قرآن کے سلسلہ کی ساری باتیں غلط اور بناوٹی ہیں جن پر ہر دو جانب اعتبار کرنا درست نہیں ہے۔

تقيّة

تقیّہ کے سلسلہ میں شیعہ حضرات بہت بدنام ہیں۔ اس معاملہ میں ہم اہل سنّت کا یہ احساس ہے کہ شیعہ مذہب کی بہترین عبادت تقیّہ ہے اور ان کے دین کی بنیاد ہی تقیّہ پر ہے اور تقیّہ کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں۔

کیا ہمارا یہ احساس درست ہے؟ یا آپسی مخاصمت، دوری اور ضد کا نتیجہ ہے؟ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی معاملہ اپنی اصل کے اعتبار سے درست اور مبنیٰ برحق ہے لیکن عام لوگوں کی اس پر عمل آوری اس کو مشکوک اور غیر معیاری بنا دیتی ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے یہاں حلالہ کا مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور وہ اس سے الگ ہوگئی۔ اب اس طلاق شدہ عورت کا کسی دوسرے مرد سے نکاح ہوگیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس مرد سے کسی بھی سبب علیحدگی ہوگئی۔ اس کی وجہ شوہر کی موت رہی ہو یا پھر طلاق! تو ایسی حالت میں اس عورت کا سابق شوہر اگر اس بات کا خواہاں کہ اپنی سابقہ بیوی سے دوبارہ نکاح کرے تو شریعت اُسے اس کی اجازت دیتی ہے۔ اور اس کام میں اب کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

لیکن اب ہمارے یہاں اس مسئلہ پر عمل کسی طرح ہوتا ہے۔ ایک شخص نے غصّہ میں آکر اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ جب ہوش آیا تو اب پچھتا رہے ہیں اور بڑی شدّت کے ساتھ اس بات کے خواہاں ہیں کہ کوئی بھی صورت ہو، طلاق شدہ بیوی دوبارہ سے گھر میں آجائے۔ کسی نے حلالہ کا مسئلہ بتا دیا۔ بس چٹ پٹ اپنے تعلق کے کسی دوسرے مرد سے اس عورت کا نکاح کرایا۔ چند دن بعد اُس سے طلاق دلوائی اور دوبارہ سے نکاح کر لیا۔ سانپ بھی مر گیا لاٹھی بھی بچ گئی۔ شریعت کا منشا بھی پورا ہوگیا اور بیوی بھی مل گئی۔

سوچئے، کیا واقعی اس طرح شریعت کا منشا پورا ہوگیا؟ اور کیا اس طرح کے عمل سے مسئلہ

حلالہ کی حیثیت مشکوک نہیں ہوگئی ؟

یا پھر۔

اسلام میں طلاق کا مسئلہ ! کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اور طلاق کا عمل قطعاً جائز ہے اور قرآن پاک نے طلاق دینے کا مکمل طریقہ بھی بتایا ہے اور اس طریقہ کی خلاف ورزی کر کے طلاق دینے والے کو حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں کوڑوں کی سزا بھی دی گئی ہے۔

لیکن اب ایک عرصہ سے طلاق کے معاملہ میں مسلمانوں کا جو طرز عمل ہے۔ اس نے طلاق کے جائز معاملہ کو دوسرے لوگوں کے لیے کس قدر ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔ گزشتہ دنوں تو پورا ملک اس کی لپیٹ میں آگیا تھا اور عام تاثر یہی تھا کہ مسلمانوں میں طلاق کے باعث ایک مسلمان عورت کی حیثیت دو کوڑی سے زیادہ نہیں ہے۔

کیا یہ بات درست ہے ؟ یقیناً نہیں۔ اسلام نے عورت کو جو مقام و منصب عطا کیا ہے کوئی دوسرا نظام اور نظریہ اُس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن عام آدمی کسی معاملہ کے اصول و ضابطہ کو کہاں دیکھتا ہے۔ اُسے جیسا کچھ عملی طور پر نظر آتا ہے وہ اُسی پر یقین کرتا ہے۔ اُسی کو سچ سمجھتا ہے۔

بالکل یہی معاملہ تقیہ کا ہے۔ اس کے تعلق سے بعض حضرات کے غلط طرز عمل نے اس کو ہم اہل سنّت میں مضحکہ خیز بنا دیا ہے اور ہم بڑی آسانی اور اطمینان کے ساتھ کسی شیعہ مسلمان کی بہتر سے بہتر بات کو تقیہ پر محمول کر لیتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ تقیہ شیعوں کے یہاں جائز ہے۔ اور اس کا مطلب ہے جھوٹ بولنا

لیکن میرا مطالعہ اس بات کی نفی کرتا ہے۔ آیئے، اس معاملہ کو ذرا تسلّی سے سمجھیں۔

"تقیہ" کے معنیٰ

جناب مولانا سیّد سعید اختر رضوی اپنی کتاب "اتمام حجّت" میں لکھتے ہیں کسی لفظ کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ لغوی اور اصطلاحی۔ لغوی معنیٰ کے لیے زبان والوں کا قول سند ہوگا۔ اور اصطلاحی معنیٰ کے لیے ان لوگوں کا قول معتبر سمجھا جائے گا۔ جنھوں نے یہ اصطلاح بنائی ہے۔

چنانچہ عربی لغت صراح میں "تقیہ" کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے معنی ۔ "پرہیز گاری"

کے ہیں۔ تقیۃ تقاۃ۔ پرہیز گاری۔

دیگر کتب لغت میں بھی ایسا ہی ہے۔

تقیّہ کے اصطلاحی معنٰی ہیں۔ کسی بڑے نقصان کے مقابلہ میں اُس سے کم درجہ کے نقصان کو گوارہ کرنا یا کسی بڑے گناہ سے بچنے کے لیے اُس سے چھوٹا گناہ اختیار کر لینا مثلاً اگر کوئی نماز میں مشغول ہو اور بچہ کنواں میں گر جائے اور کوئی دوسرا اُسے نکالنے والا نہ ہو۔ ایسی حالات میں اُس کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں۔ نماز میں مشغول رہے تو بچّہ ہلاک ہوتا ہے اور بچّہ کو کنویں سے نکالنے کی فکر کرے تو نماز ختم ہوتی ہے جو ایک گناہ ہے لیکن بچّہ کی ہلاکت اس سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس لیے شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے یہ واجب ہے کہ نماز قطع کر کے بچّہ کو بچالو۔ غرض ایسی حالت میں نماز کا توڑنا حرام نہیں بلکہ مستحسن ہے اور بعض حالات میں واجب بھی ہو جائے گا۔

تقیّہ کرنا جائز ہے

تقیّہ کے لغوی اور اصطلاحی معنٰی سے آگاہی کے بعد مولانا محترم نے تقیّہ کے جائز ہونے کے سلسلہ میں قرآنی آیات سے بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں۔

"جو ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ یقیناً قابلِ عذاب و ملامت ہے) مگر وہ شخص جو مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہے (وہ قابل ملامت نہیں ہے) لیکن جو کفر کے لیے اپنا سینہ کھول دے اور خوشی سے کفر قبول کرلے۔ اُس کے لیے عذاب عظیم ہے۔"

(سورہ النحل آیت ۱۰۶)

یعنی اپنی جان بچانے کی خاطر کوئی زبانی کفر کا اقرار کرے تو یہ عمل قابل مواخذہ نہیں ہے اس سے جان اور ایمان دونوں کی حفاظت ہے اور اسی کا نام تقیّہ ہے۔

اس آیت کی شرح میں تمام مفسرین نے عمار بن یاسرؓ کے واقعہ کو بیان کیا ہے جو اس طرح ہے کہ عمار بن یاسرؓ کی آنکھوں کے سامنے اُن کے والدین کو سخت اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا گیا۔ پھر اُن کو بھی اتنی ہی ناقابل برداشت اذیت دی گئی کہ آخر انھوں نے جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیا جو

کفار اُن سے کہلوانا چاہتے تھے۔ پھر وہ روتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یارسول اللہ، مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک میں نے آپ کو بُرا اور اُن کے معبودوں کو اچھا نہ کہہ دیا۔ حضور نے پوچھا اب دل کا کیا حال پاتے ہو؟ عرض کیا۔ ایمان پر پوری طرح مطمئن۔ اس پر حضور نے فرمایا۔ اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو پھر یہی باتیں کہہ دینا۔"

محترم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے بھی سورہ النحل کی اس آیت کے تفسیری نوٹ میں اس واقعہ کو اسی انداز اور پس منظر میں بیان کیا ہے۔

"مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور رفیق ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کریگا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم اُن کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ۔ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ تم اپنے دل کی باتیں پوشیدہ رکھو یا ظاہر کرو خدا تو اس کو بہر حال جانتا ہے۔ زمین اور آسمان کی کوئی شے اُس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اُس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔"

(سورہ آل عمران آیت ۲۸، ۲۹

پہلی آیت تقیّہ کے استحسان اور جواز کو ببانگ دہل بیان کر رہی ہے۔ مولانا موصوف کہتے ہیں کہ جیسا کہ میں لغت کی کتاب "صراح" کے حوالے سے بیان کر چکا ہوں کہ تقاۃ اور تقیہ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور ان کا یہ مفہوم پوری طرح واضح ہے کہ خوف جان کے وقت کفار سے اظہار دوستی جائز ہے۔

سیّد مودودی مرحوم نے آل عمران کی اس آیت ۲۸ پر تفسیر نوٹ اس طرح تحریر کیا ہے۔ اگر کوئی مومن کسی دشمن اسلام جماعت کے چنگل میں پھنس گیا ہو اور اُسے اُن کے ظلم و ستم کا خوف ہو تو اس کو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا اُنہی میں کا ایک فرد ہے یا اُس کا مسلمان ہونا ظاہر ہو گیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے وہ کفار کے ساتھ دوستانہ رویّہ کا اظہار کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ شدید خوف کی حالت میں جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو کلمہ کفر تک کہہ جانے کی رخصت ہے۔

علامہ مودودیؒ نے اگلے نوٹ نمبر ۲۶ میں لکھا ہے۔ لیکن انسانوں کا خوف اس قدر نہ چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمہاری دنیا بگاڑ سکتے ہیں مگر خدا تمہیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہذا اپنے بچاؤ کے لیے اگر بدرجہ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو بس اس حد تک ہونا چاہیئے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تم اپنی جان و مال کا تحفظ کر لو۔"

اس تفسیر کی نوٹ کا عنوان تفہیم القرآن جلد اوّل کے انڈکس میں اس طرح تحریر ہے۔ "تقیّہ، کس حالت میں اور کس حد تک کیا جا سکتا ہے۔"

یعنی مشروط طور پر تقیّہ اہل سنت علماء کے نزدیک بھی جائز ہے۔

اس سلسلہ میں ابتدار اسلام کا یہ واقعہ بھی بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

جب رسول اللہؐ نے اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تو بالکل ابتدار میں آپؐ خفیہ طریقہ سے ہدایت فرماتے تھے اور یہ کام آپ زیادہ تر زید بن ارقم کے مکان پر لوگوں کو اکٹھا کر کے کیا کرتے تھے۔ نماز بھی چھپ کر پڑھی جاتی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو احساس ہوا کہ جب ہم حق پر ہیں تو پھر یہ کام پوشیدہ رہ کر کیوں کریں چنانچہ انھوں نے رسول اکرمؐ سے اصرار کیا کہ آپؐ مسجد الحرام میں جا کر اظہار اسلام کریں۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ ہم کم ہیں۔ (اس وقت اصحاب رسول کی تعداد اڑتیس ۳۸ تھی) اس لیے ابھی اظہار مناسب نہیں ہے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اپنا اصرار جاری رکھا۔ یہاں تک کہ رسول خدا اور آپؐ کے ساتھی مسجد الحرام میں آئے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی اور رسول اللہؐ بیٹھے رہے۔ بس مشرکین حضرت ابوبکرؓ اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے اور بہت بری طرح مارا پیٹا۔ حضرت ابوبکرؓ کو سب سے زیادہ مارا۔ آپ کا چہرہ سوج گیا۔ یہاں تک کہ ناک اور بقیہ چہرہ میں امتیاز نہ ہوتا تھا۔"

یہ واقعہ علامہ ابن ہشام نے سیرت ابن ہشام میں اور جناب شاہ عبدالحق نے مدارج نبوۃ میں بھی تحریر کیا ہے۔

یعنی اسلامی تاریخ کا یہ ایک معتبر واقعہ ہے۔ محترم رضوی صاحب کہتے ہیں۔ آیئے اسی واقعہ

پر غور کریں۔ وہ لکھتے ہیں۔

۱ــــ پہلی چیز جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ رسالت مآب پوشیدہ طریقہ سے تبلیغ کرتے تھے اور اس وقت تک اعلان نہیں کرنا چاہتے تھے جب تک کافی طاقت حاصل نہ ہو جائے یعنی رسالت مآب بھی اصول تقیہ پر عامل تھے۔ یہی مقصد ہے امام محمد باقر کے اس ارشاد گرامی کا کہ۔ "التقیہ دینی و دین آبائی یعنی تقیہ میرے اور میرے آباو اجداد کا دین ہے۔"

۲ــــ حضرت ابوبکرؓ تقیہ کی مصلحت کو نہ سمجھ پائے اور جوش تبلیغ میں وہ کام کر گئے جس کو رسول اللہ مناسب نہیں سمجھ رہے تھے۔ لہذا نقصان اُٹھایا۔ کفار اور مشرکین کی اذیتوں کا نشانہ بنے۔

لہذا دین میں مصلحت کو پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری اور لازمی ہے اور اس مصلحت دینی کا نام ہی تقیہ ہے۔

غرض محترم رضوی صاحب نے کئی اور آیات، احادیث اور واقعات بیان کرنے کے بعد پورے اعتماد کے ساتھ لکھا ہے۔

یہ اتنی بہت سی آیات قرآنی، احادیث اور واقعات صاف صاف اس امر کو بتا رہے ہیں کہ اگر جان کا خطرہ ہو اور اس کے تحفظ کے لیے جھوٹ موٹ اقرار کفر کرنا پڑے جس کی مضرت ہلاکت مومن سے کم ہے تو وہ جھوٹ گناہ نہیں رہ جاتا بلکہ جائز ہو جائے گا۔ اور اسی کا نام تقیہ ہے۔"

لیکن علامہ سیّد مودودیؒ کی طرح علامہ رضیؒ نے بھی تقیہ کو مشروط کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پس تقیہ کے وقت یہی طریقہ ممدوح ہے کہ کفار کی دوستی کا اظہار زبان سے یوں کرے کہ ان کے ساتھ اختلاط رکھے اور ظاہری برتاؤ اور اخلاق اچھا رکھے مگر دل میں پہلے ہی کی طرح اُن کی عداوت پوشیدہ رکھے اور ان سے برات اور بیزاری کا اعتقاد رکھے اور زبان سے اظہار دوستی و اقرار کفر میں بھی ایسا عنوان حتی الامکان اختیار کرے کہ ذو معنیٰ جملے کہے جس سے کفار اپنا مطلب سمجھیں اور اور اس کی مراد کچھ اور ہو۔"

ایسے ذو معنی الفاظ یا جملوں کے استعمال کو "توریہ" کہا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال مومن آل فرعون کے واقعہ سے ملتی ہے۔

مومن آل فرعون، فرعون کے چچازاد بھائی اور ولی عہد سلطنت تھے۔ فرعون کے درباریوں میں

سے کسی نے اُس سے کہا کہ آپ کے بھائی آپ سے منحرف ہیں۔ یہ سُن کر فرعون نے اُن سے حقیقت حال معلوم کرنا چاہا۔ دربار بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے درباریوں سے کہا۔ بتاؤ تمہارا خالق کون ہے؟ سب نے کہا کہ فرعون۔ انھوں نے پھر معلوم کیا۔ تمہارا رب کون ہے؟ سب نے کہا۔ فرعون۔ پھر پوچھا کہ تمہارا رازق کون ہے؟ پھر سب نے کہا۔ فرعون۔

تب مومن آل فرعون نے فرعون سے کہا۔ میں علی الاعلان یہ کہتا ہوں کہ جو ان کا خالق ہے جو ان کا رب ہے اور جو ان کا رازق ہے۔ وہی میرا خالق، رب اور رازق ہے۔ فرعون مطمئن ہو گیا۔ حالاں کہ مومن آل فرعون کا منشا واضح تھا۔

تقدیہ کی مثال ہمیں اس واقعہ میں بھی ملتی ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی بہت زور شور سے جاری تھی۔ برطانوی حکومت اس آزادی کی تحریک کو دبانے کے لیے قائدین تحریک کو دھڑا دھڑ جیلوں میں ٹھونس رہی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع پر مولانا حسین احمد مدنیؒ صاحب کے پاس ایک سپاہی وارنٹ لیے ہوئے آیا اور آپ سے آپ ہی کے بارے میں دریافت کیا۔

آپ اس وقت ایک جگہ کھڑے ہوئے تھے چنانچہ اپنی جگہ سے چند قدم کسی جانب ہٹے اور اس کے بعد سپاہی کو جواب دیا۔ ابھی یہیں تھے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

تقیہ پر یہ مختصر سی گفتگو میں نے آج پہلی بار نہیں کی ہے کہ بس اب وضاحت ہو گئی اور معاملہ رفع دفع ہوا۔ میں نے تو شیعہ حضرات کے نقطہ نظر کو اُن کے دلائل کی روشنی میں سمجھے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے ورنہ طرفین نے تقیہ کے موضوع پر خوب خوب جم کر لکھا ہے حمایت کرنے والوں اور اسے جائز سمجھنے والوں نے اس کے حق میں ڈٹ کر لکھا ہے۔ اور مخالفین نے بھی کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔

چنانچہ ایک صاحب نے پوری قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت امام حسین کے کردار نے تقیہ کی جڑیں کاٹ دیں۔ تقیہ کے لیے اس سے بہتر وقت اور کون سا ہو سکتا تھا۔ حضرت حسینؓ چاہتے تو تقیہ اختیار کر کے ظاہری طور پر بیعت کر کے سکھ چین کی زندگی بسر کرتے مگر اللہ اکبر، شیر خدا کے فرزند تھے۔ تقیہ کا تصور بھی خاطر مبارک میں نہ لائے اور آپ نے اپنے کردار سے تقیہ کو ناجائز قرار دے کر یہ بتا دیا کہ

جس دین میں تقیہ عین ایمان ہو وہ میرا دین نہیں ہے۔"

معترض کی یہ بات کافی باوزن معلوم ہوتی ہے۔ ہاں اگر ہمیں تقیہ کے اصول اور ضوابط نہ معلوم ہوں اور ہم معاملے کو سمجھنے اور سمجھانے سے بے زار ہوں اور اگر ہمارا منشا و مقصد صرف مخالفت کرنا ہو ورنہ یہ ایک غلط فہمی ہے جو معاملہ کی صحیح نوعیت کو سمجھ کر دور ہو جانا چاہیئے۔

مولانا سید اختر سعید صاحب لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ تقیہ کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ بیش قیمت شے کو بچاؤ۔ چنانچہ تقیہ سے متعلق سارے واقعات اسی حد تک محدود ہیں جب تک اس کتمانِ ایمان سے کسی اسلامی مفاد پر آنچ نہ آتی ہو۔ کیوں کہ اگر ظاہری اقرار کفر کا یہ اثر پڑے کہ اقرار کرنے والے کی جان تو بچ جائے لیکن اسلام کا حقیقی مفاد قربان ہو جائے تو اس کے مقابلہ میں ایک یا چند افراد کی زندگی چلی جانا زیادہ اہم نہیں ہے۔

تقیہ کی وضاحت میں علامہ سیدؒ مودودیؒ نے بھی یہی بات کہی ہے۔ علامہ موصوف سورہ آل عمران کی آیت ۲۹ پر اپنے تفسیر نوٹ نمبر ۲۶ میں لکھتے ہیں۔ (آیت ۲۸ اور ۲۹)

"اپنے بچاؤ کے لیے بدرجہ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہیئے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تم اپنی جان و مال کا تحفظ کر لو۔ لیکن خبردار، کفر اور کفار کی کوئی ایسی خدمت تمہارے ہاتھوں انجام نہ پائے جس سے اسلام کے مقابلہ میں کفر کو فروغ حاصل ہونے لگے اور مسلمانوں پر کفار کے غالب آجانے کا امکان ہو۔ خوب سمجھ لو کہ اگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے تم نے اللہ کے دین کو یا اہل ایمان کی جماعت یا کسی ایک فردِ مومن کو بھی نقصان پہنچایا۔ یا خدا کے باغیوں کی کوئی خدمت انجام دی تو اللہ کے محاسبہ سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔ جانا تم کو بہرحال اُسی کے پاس ہے۔"

اب ہم دیکھیں کہ حضرت امام حسینؓ منصب و مرتبہ کے جس بلند مقام پر فائز تھے تو کیا اُن کے لیے یہ جائز تھا کہ وہ تقیہ اختیار کر کے اپنے اور اپنے ساتھیوں کی تو جان بچا لیتے اور اسلام کی حدود کو پامال ہونے کے لیے چھوڑ دیتے۔

یقیناً یہ حضرت امام حسینؓ کے مرتبہ و منصب سے فروتر بات تھی کہ وہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے اسلامی حدود کو تباہ و برباد ہونے دیتے اور اگر خدا نہ کرے ایسا ہو جاتا تو رہتی

دنیا تک غیر اسلامی نظریہ کے غلبہ کو روکنے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی اور پھر یہ کہنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

آخری بات

جناب سعید احمد رضوی صاحب نے تقیّہ پر اپنی گفتگو تمام کرتے ہوئے بالکل آخر میں لکھا ہے کہ ایمان یا کفر کی بہ حیثیت مجموعی چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ دل سے اعتقاد صحیح اور زبان سے اس کا اقرار۔ یہ ظاہر و بظاہر ایمان ہے۔

۲۔ دل سے خلاف اسلام اعتقاد اور زبان سے بھی اسی اعتقاد کا اعلان۔ یہ ظاہر و بظاہر کفر ہے

یہ دونوں صورتیں ظاہر و بظاہر ایک دوسرے کی نقیض اور مخالف ہیں۔

۳۔ دل سے اعتقاد کفر اور زبان سے اقرار اسلام۔ یہ نفاق یا پوشیدہ کفر ہے۔

۴۔ دل سے اعتقاد اسلام اور زبان سے اقرار و کفر بحالت مجبوری۔ یہ تقیہ یا پوشیدہ ایمان ہے۔

چنانچہ مولانا رضوی صاحب کا کہنا ہے کہ تقیہ کا مزاق اڑانا تو کجا۔ اس کی مخالفت بھی درست نہیں ہے۔

میرا بھی یہی احساس ہے کہ مطالعہ کی بنیاد پر جب ہم اس حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں کہ تقیہ کوئی ناجائز چیز نہیں ہے ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب شیعہ حضرات نے تقیہ کو اپنی پہچان بنا لیا ہے تو پھر ہم اہل سنت اسے کس طرح اپنا سکتے ہیں۔

میں اس وقت آپ سے تقیہ اپنانے یا نہ اپنانے کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا منشا تو صرف اتنا ہے کہ اوّل ہماری سمجھ میں یہ بات آجائے کہ شریعت نے تقیہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ شیعہ حضرات اسی سبب سے تقیہ کرتے ہیں۔ اُن کی اپنی کوئی خانہ ساز شے نہیں ہے۔

دوم۔ دین میں جب کوئی بات جواز کا حق رکھتی ہے تب اُس کے سلسلہ میں ہمارا رویہ اور طرز عمل

کیا ہونا چاہیے؟۔ اس بارے میں ہمارے علمار نے ہمیں یہ بتایا ہے۔

محترم ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے کس قدر سچّی بات کہی۔ وہ لکھتے ہیں

یہ انصاف کی بات نہیں ہے کہ ہم کسی انسان یا انسانی جماعت پر یہ الزام لگائیں کہ اس نے اپنے لیے کوئی خاص فقہی رائے اپنالی ہے۔ جب کہ وہ جماعت یقین رکھتی ہے کہ یہی رائے زیادہ ..صحیح اور درست ہے اور اس کے لیے شرعاً اس کی پابندی ضروری ہے۔ ورنہ آخرت میں اس کا محاسبہ ہوگا۔ اگرچہ دوسروں کی نگاہ میں وہ رائے کمزور ہو۔ اس لیے کہ جس رائے کو وہ جماعت درست سمجھتی ہے اور جس پر اُسے یقین اور اعتقاد ہے۔ اسی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ایسی حالت میں اگر وہ اپنے مسلک کو صحیح مان کر اُسی کے مطابق عمل کرتی ہے تو اس کا یہ رویّہ زیادہ افضل ہے۔ اور پرہیزگاری کی روح سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

ڈاکٹر موصوف اپنی اس رائے کے لیے دلیل پیش کرتے ہیں۔

"قدیم اور جدید علمار کی ایک بڑی تعداد یہ رائے رکھتی ہے کہ مسلمان عورت کو اپنا پورا بدن پردے میں رکھنا چاہیے سوائے چہرہ اور ہتھیلیوں کے۔ کیوں کہ ان لوگوں کے خیال میں آیت کریمہ۔ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا" (النور ۳۱) میں جن چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ان سے مراد یہی چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ ان علمار نے اپنی اس رائے کو احادیث، آثار اور واقعات سے مدلّل بھی کیا ہے۔ ہمارے دور کے علما کی ایک بہت بڑی تعداد نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے ـــــ میں بھی اسی رائے کا حامی ہوں۔ اسی طرح جلیل القدر علمار کا ایک دوسرا گروہ بھی ہے اور ان کا مسلک یہ ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیوں کا پردہ بھی واجب ہے۔ علمار کے اس گروہ نے بھی اپنی رائے کو نصوص قرآنی احادیث اور آثار سے مدلّل کیا ہے۔ آج کے دور کے علمار کی بھی ایک بڑی تعداد خصوصاً ہندوستان، پاکستان، سعودی عربیہ اور خلیجی ممالک میں اسی دوسرے گروہ کے علمار کی رائے کو درست مانتی ہے اور اس پر عمل کرتی ہے تو کیا ایسی خواتین جو اس فقہی مسلک پر یقین رکھتی ہیں اور اسے اپنے دین کا جزو مانتی ہیں اُن کو اس کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک سے دستبردار ہو جائیں اور ہماری تہمت سے بچنے کے لیے جنت کو بیچ دیں اور دوزخ خرید لیں۔ یقیناً نہیں۔ یہ ایک طرح سے انتہا پسندی ہے ہمیں دین میں ایسی انتہا پسندی سے بچنا چاہیے۔"

بس تقیّہ کے معاملہ میں یہی میرا احساس ہے۔

"عام شیعوں سے جو قابل مذمت افعال واقوال سرزد ہوتے ہیں وہ اگرچہ ان سے زیادہ ہیں جن کا ذکر ان صاحب نے کیا ہے، لیکن یہ ساری باتیں امامیہ اثنا عشریہ اور زیدیہ میں نہیں پائی جاتیں، البتہ غالیوں اور ان کے پیروکاروں میں اس قسم کی باتیں پائی جاتی ہیں۔"

(منہاج السنۃ النبویہ صفحہ ۱۳۔ از علامہ ابن تیمیہ)

مذہب شیعہ اثنا عشریہ کے نام سے مشہور مذہب جعفریہ ایسا مذہب ہے جسے اہل سنت کے باقی مذاہب کی طرح شرعاً اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ یہ چیز سمجھیں اور کسی مذہب کے ساتھ ناحق کرنے سے خود کو پاک کریں۔ اللہ کا دین اور اس کی شریعت کسی ایک مذہب کے تابع اور کسی ایک مذہب میں منحصر نہیں ہے۔ سب مجتہد ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔"

(الشیخ محمود شلتوت۔ سابق شیخ جامعۃ الازہر مصر)

مسئلہ بداء

یہ ایک علمی مسئلہ ہے۔ عام سُنّی مسلمان تو کُجا۔ غالباً عام شیعہ مسلمان بھی اس مسئلہ سے پوری طرح واقف و آگاہ نہ ہوگا۔ لیکن اس اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے کہ طرفین نے اس مسئلہ پر خوب خوب زورِ قلم آزمایا ہے اور اس مسئلہ کا تعلق ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ کی فضا سے ہٹ کر جس نے ہمیشہ معاملات کو سلجھانے کے بجائے مزید اُلجھایا ہے اور نفرت و عداوت میں اضافہ ہی کیا ہے۔ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے شیعہ نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور جب سمجھنے کی کوشش کریں گے تو کچھ بات بھی بنے گی۔ یہی بات بنانے کے لیے میں نے بھی کوشش کی ہے۔

محترم مولانا سید سعید اختر صاحب رضوی نے اپنی کتاب "اتمام حجت" میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ میں اس وقت اسی تفصیلی مضمون سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں۔ لیکن میں نے مولانا محترم کی بعض غیر ضروری عبارت اور بہت سے نامناسب جملوں کو ضرور حذف کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ضروری جملوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔ لیکن اصل مضمون کی حیثیت کو ہر طرح برقرار رکھا ہے

بدار کا مفہوم

مولانا محترم لکھتے ہیں۔

شیخ مفیدؒ اپنی مشہور تصنیف "اوائل المقالات" میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"میں بدار کے معنی کے متعلق وہی کہتا ہوں جو تمام مسلمان نسخ اور ایسی ہی دوسری چیزوں کے متعلق کہتے ہیں۔ مثلاً توانگری دینے کے بعد فقیر بنا دینا یا صحت مند رکھنے کے بعد مریض کر دینا یا زندہ کرنے کے بعد موت دے دینا یا (قائلین کے عقیدہ کے مطابق) اعمال کے مطابق عمر اور رزق میں کمی بیشی کر دینا۔ اب رہ گیا بدار کے اطلاق کا سبب تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان

جو ہستیاں واسطہ تھیں (یعنی پیغمبر اور ائمہ) ان کی زبان سے یہی لفظ سنا گیا ہے اور اگر اس لفظ کا استعمال ایسی روایتوں میں نہ ہوتا جن کی صحت قطعی ہے تو میں اس کا استعمال کبھی جائز نہ سمجھتا۔ جس طرح کہ اگر اس کے متعلق آیات و احادیث وارد نہ ہوتیں کہ خدا غضب ناک ہوتا ہے اور راضی ہوتا ہے اور محبت کرتا ہے اور تعجب کرتا ہے تو غضب رضا، محبت اور تعجب کے الفاظ کا استعمال اس کے متعلق جائز نہ ہوتا۔ لیکن جب روایتوں میں یہ الفاظ آئے ہیں تو اُن کو ہم نے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ان سے ہم وہ مفہوم مراد لیتے ہیں جس کا کوئی عقل انکار نہیں کر سکتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ عقیدہ بدار کے باب میں میرے اور تمام مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو لوگ اس معاملہ میں شیعوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ صرف لفظ بدار کی مخالفت کرتے ہیں۔ مفہوم کی نہیں اور اس لفظ کے استعمال کرنے کی علت میں نے اس طرح واضح کر دی ہے کہ اب اس میں کلام کی گنجائش نہیں ہے اور میرا مذہب تمام شیعوں کا مذہب ہے۔"

علامہ شیخ فضل اللہ زنجانی نے اس پر مندرجہ ذیل حاشیہ تحریر فرمایا ہے۔

"لفظ بدار کے دو معنی ہیں۔ اوّل تو ظہور اور یہی لفظ بدار کے اصل معنی ہیں۔ بحیثیت وضع لغوی کا دوسرے ایک ارادہ سے دوسرے ارادہ کی طرف پلٹنا۔ کسی چیز کے متعلق نیا علم یا ظن حاصل ہونے کی بنا پر۔ اس دوسرے معنی کے لحاظ سے لفظ بدار کا استعمال ہرگز ہرگز خداوند عالم کے حق میں جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور یہ عقیدہ لازم آئے گا کہ خداوند عالم کو ایسی چیز کا علم ہوتا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ حالاں کہ قطعی دلیلیں اس کے خلاف دلالت کرتی ہیں۔ پس جہاں بھی ہم اس لفظ کو خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے ایسا امر ظاہر ہوا۔ جس کی ہم کو اُمید نہیں تھی یا ایسی شے خدا نے واقع فرمائی جس کے وقوع کا بندوں کو خیال نہیں تھا۔ اور اسی معنی پر معمول کیا جائے گا۔ ہر لفظ بدار جو قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ اور لفظ بدار کے استعمال کا جواز (اسی معنی میں) ان آیات کتاب خدا کی وجہ سے ہے۔ جن میں یہ لفظ خدا کی طرف منسوب کر کے استعمال کیا گیا ہے مثلاً خدا کا یہ قول وبدا لھم من اللہ مالم یکونوا یحتسبون "یعنی اور ظاہر ہوئی اُن کے لیے خدا کی طرف سے وہ چیز جس کا ان کو خیال و گمان نہ تھا۔

اس آیت سے بدار کے استعمال کے جواز کے ساتھ اس کا مفہوم بھی ظاہر ہو رہا ہے۔

مخالفین اسلام کے چند عقائد

مولانا محترم مزید تشریح کے تحت لکھتے ہیں کہ اصل مسئلہ سے قبل تمہیداً دو تین باتیں سمجھ لینا ضروری ہیں۔

۱۔ یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا اور ہے کہ خدا نے دنیا پیدا کی اور ہر کام سے فراغت کے بعد اب آرام کر رہا ہے۔

۲۔ یونانی فلسفیوں کا خیال تھا کہ خدا نے عقل اوّل کو پیدا کیا اور عقل اوّل نے عقل ثانی اور فلک اول کو پیدا کیا اور عقل ثانی نے عقل ثالث اور فلک ثانی کو پیدا کیا اور یہ سلسلہ عقل نہم تک پہنچا۔ جس نے عقل دہم اور فلک نہم کو پیدا کیا اور عقل دہم نے باقی دنیا کو پیدا کیا۔ چوں کہ ان فلاسفہ کے خیال میں خدا واحد ہونے کی وجہ سے صرف ایک ہی کام کر سکتا ہے اور بس۔ اس لیے خدا کا کام عقل اوّل کی خلقت کے بعد ختم ہو گیا۔ اب جو عالم میں پیدا ہوا ہے یا دن رات جو حوادث ہو رہے ہیں۔ وہ سب ان عقول عشرہ کا کرشمہ ہیں۔ خدا کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳۔ فلسفیوں کے ایک اور گروہ کا (جن کو اصحاب کمون و ظہور کہا جاتا ہے) یہ خیال تھا کہ خدا نے ازل میں ایک ہی آن میں تمام چیزوں کو پیدا کر دیا ہے۔ سارے عالم کی ازل اوّل تا آخر ایک ہی ساتھ خلقت ہوئی ہے۔ البتہ ان میں سے بعض چیزیں پہلے ظاہر ہو رہی ہیں اور بعض بعد میں ظاہر ہو رہی ہیں تو یہ تقدّم و تاخر صرف ظہور میں ہے۔ خلقت میں نہیں ہے۔ جیسے اخبار کا ورق ایک مرتبہ میں چھپ جاتا ہے لیکن پڑھنے میں آپ ایک لفظ اور ایک سطر کو پہلے پڑھتے ہیں اور دوسرے لفظ کو بعد میں پڑھتے ہیں۔

۴۔ فرقہ معتزلہ کے ایک سرکردہ نظام کا بھی عقیدہ انھیں فلاسفہ کے عقیدہ کی طرح یہ ہے کہ وجود اور عدم کے درمیان ایک اور کڑی ہے جس کا نام ثبوت ہے اور خدا نے ازل ہی میں تمام چیزوں کو آن واحد میں ایک ہی دفعہ ثابت کر دیا ہے یعنی خلق کر دیا ہے۔ اب تقدم اور تاخر صرف دنیا کے اسٹیج میں ظاہر ہونے میں ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک نہ تو نور رسالت مآب صلعم خلقت میں ساری دنیا سے مقدم ہے اور نہ ابولہب اور ابوجہل کی روح نور محمدؐ کے بعد پیدا ہوئی بلکہ سب ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔

غرض یہ چاروں عقیدے علی الاعلان خدا کو اُس کی خدائی سے معطل کر چکے ہیں۔ یہودی صاف

صاف خدا کو خواب راحت میں سلا رہے ہیں۔ گویا اب دنیا کا خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یونانی فلاسفہ کا پہلا گروہ خدا کو اتنی بھی اجازت نہیں دیتا کہ یہ عقول عشرہ اگر کوئی غلطی کریں تو ان کو ٹوک سکے۔ کیونکہ ٹوکنا بھی دوسرا کام ہو جائے گا۔ جو ان کے نزدیک خدا سے محال ہے۔ اصحاب کمون وظہور، معتزلہ اور گروہ نظام کا مقصد یہ ہے کہ خدا کو جو کچھ کرنا تھا۔ وہ ازل ہی میں کر چکا۔ اب اس کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ گویا اب خدا معطّل ہے۔

مولانا محترم لکھتے ہیں۔

ان سب عقائد کو رد کرتے ہوئے خداوند عالم نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر اپنے بندوں کی رہنمائی فرمائی ہے۔ جس کی تشریح مندرجہ ذیل ہے۔

اسلامی عقیدہ

اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ خدا ہی ہر شے کا خالق ہے۔ وہ یہودیوں اور فلسفیوں کے قول کے مطابق معطل نہیں ہے اور نہ معتزلہ یا گروہ نظام کے قول کے مطابق ازل ہی میں سب کچھ پیدا کر کے بیٹھ گیا ہے اور اب جو کچھ ہونے والا ہے وہ خواہ مخواہ ظاہر ہو کر رہے گا۔ کیوں کہ اس کی خلقت ہو چکی ہے اور اب خدا کو بھی کوئی اختیار نہ رہ گیا ہے۔ بلکہ قرآن پاک کی آیات یہ بتاتی ہیں کہ۔

"خدا ہی کے اختیار میں پیدا کرنا بھی ہے اور امر بھی ہے۔"

"خدا ہی سے مانگتے ہیں! زمین والے بھی اور آسمان والے بھی۔ خدا ہر روز ایک نئی شان میں ہے۔"

(سورہ الرحمٰن)

یعنی وہ ہمیشہ کسی کو معدوم کسی کو موجود کسی کو مریض، کسی کو تندرست، کسی کو پیدا کسی کو فنا کرتا رہتا ہے۔ عالم کے تصرفات اور تغیّرات ہر دم اُسی کے حُکم سے ہوتے رہتے ہیں۔ وہ نہ تو معطّل ہے اور اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

یہودی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ انھیں کے ہاتھ بندھ جائیں اور

ان پر لعنت ہے ان کے اس قول کی وجہ سے بلکہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں (یعنی اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔) وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔"
(سورۃ المائدۃ)

تکوین اور تشریع

تکوین کے ہر چھوٹے بڑے امر میں ہر ہر آن اس کی طرف سے قطعی اور آخری فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے امر کے بغیر عالم تکوین میں کوئی بات ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔

یعنی ہر انسان اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ ہمارے کام دو قسم کے ہیں۔ بعض کاموں پر ہمیں اختیار اور قدرت حاصل ہے اور اس کی بنا پر ہماری تعریف یا مذمت بھی ہوتی ہے اور ہم آخرت میں ثواب یا عذاب کے مستحق بھی ہوں گے۔ مثلاً نماز پڑھنا۔ کہیں آنا جانا۔ بولنا چپ رہنا یا کسی کا قتل کر دینا وغیرہ وغیرہ اور کچھ کام ایسے ہیں جن پر ہمیں قدرت اور اختیار حاصل نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس پر ہماری مدح یا مذمت بھی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً پیدائش، اولاد کا ہونا یا نہ ہونا، صورت شکل کا اچھا ہونا یا خراب ہونا وغیرہ وغیرہ۔

ان دونوں کاموں کا فرق اس طرح واضح ہو جائے گا کہ اگر کوئی بیمار ہو تو آپ اس سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ تم اچھے کیوں نہیں ہو جاتے؟ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ علاج کیوں نہیں کرتے یا فلاں حکیم کا علاج کیوں نہیں کرتے۔ آپ دیکھیں تو سہی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ اچھے ہو جانے کا مطالبہ نہیں کرتے علاج کرانے کا مطالبہ کرتے ہیں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اچھا ہو جانا مریض کے قدرت و اختیار سے باہر کی بات ہے۔ اسی لیے آپ اس سے اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ البتہ علاج کرانا اُس کے بس کی بات ہے اس لیے اُس کے ترک پر اُس کی سرزنش اور ملامت کی جاتی ہے۔

جو کام بندے کے اختیار کے اندر ہیں ان کو "امر تشریعی" یا شریعت کہا جاتا ہے۔

جو کام بندے کے اختیار کے باہر یعنی خدا کے اختیار میں ہیں ان کو "امر تکوینی" یا خلقت کہا جاتا ہے۔

نسخ

خداوند عالم اسلامی عقیدہ کے مطابق تکوینی امور میں (جن کا تعلق خلق اور تدبیر عالم سے ہے تو مختار مطلق اور مغفرت علی الاطلاق ہے ہی تشریعی امور کے لیے بھی جن کا تعلق بندوں کے اختیار سے ہے حضرت آدمؑ سے خاتم النبیینؐ تک وہ ہمیشہ ایک نہ ایک لائحہ عمل اور طریقہ زندگی پیغمبروں کے ذریعہ بندوں تک بھیجتا رہا تاکہ بندے اُس کے مطابق زندگی بسر کر کے اللہ کی رضا و جنّت کے مستحق ہوں اور اور اللہ کی ناراضگی و جہنّم سے بچیں۔ اسی لائحہ عمل کو شریعت یا دین کہتے ہیں۔ آخری دین "دین محمدی" ہے۔ جو تمام سابقہ ادیان کا ناسخ ہے۔

نسخ کا مفہوم یہ ہے کہ خدا بندوں کی صلاحیت روحانی و جسمانی اور عقلی و ذہنی قوتوں کی پختگی یا یا خامی کا لحاظ کرتے ہوئے احکام میں تغیّر و تبدل اور ترمیم کرتا ہے تاکہ اس کے احکام تمدن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ دے سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ نوع انسانی تو آگے بڑھتی جائے اور اس کا دین اس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ خداوند عالم نسخ کی مصلحت کو ان الفاظ میں ظاہر فرماتا ہے۔

"ہم جس آیت (حکم یا حجّت خدا) کو منسوخ کرتے ہیں یا لوگوں کے حافظہ سے محو کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی (مطابق مصلحت) آیت دوسری لا دیتے ہیں۔"

(سورہ البقرہ)

نسخ کے بارے میں غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ کیا خدا پچھلی شریعت میں کچھ بھول گیا تھا۔ یا غلطی کر گیا تھا۔ جس کی اصلاح کے لیے دوسری شریعت بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

علمار اسلام کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ پہلی شریعت میں نہ بھول کی تھی اور نہ غلطی کی تھی بلکہ اس زمانہ میں وہی احکام مطابق مصلحت تھے۔ لیکن جب زمانہ بدلا، ماحول بدلا، خیالات بدلے، صلاحیتوں نے ترقی کی، دماغی صلاحیتوں میں نشوونما ہوئی تو پھر شریعت کا بدلنا لازمی تھا۔ مثلاً بچّے کے لیے جو لباس بنایا جاتا ہے۔ اُس کے جُثہ کے لحاظ سے اس وقت وہی موزوں ہوتا ہے مگر جوان ہونے کے بعد اگر اس لباس کو اُس سے پہننے کو کہا جائے تو یہ سراسر نا سمجھی ہے بلکہ اس وقت اب دوسرا لباس

بنانا پڑے گا اور اس بنا پر درزی پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ کیا اُس نے پہلا لباس غلط بنایا تھا اس میں کچھ بھول گیا تھا۔ جواب دوسرے لباس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ مختصر یہ کہ اس سے درزی کی مہارت ثابت ہوتی ہے۔ نہ کہ نا سمجھی یا بیوقوفی۔

اور جس طرح اس مثال میں درزی پہلے ہی دن جانتا تھا کہ جب اس نے اس کم سن کا لباس قطع نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی اُسے معلوم تھا کہ چھ ماہ یا سال بھر کے بعد یہ لباس اس بچّے کے لیے ناموزوں ہو جائیگا اسی طرح خداوند عالم پہلی شریعت کے بھیجنے کے وقت کا کیا ذکر، آدم کی خلقت سے پہلے بھی جانتا تھا کہ اتنی صدیوں کے بعد یہ شریعت نوع انسانی کے لیے ناموزوں ہو جائے گی اور دوسری شریعت بھیجی جائے گی۔ اس سے خدا کا علم کا ثبوت ملتا ہے نہ کہ بھول یا غلطی کا۔

امور تکوینی میں تنسیخ

اب جس طرح خدا نے بندوں کے لیے شریعت بھیجی اور اس میں حسب تقاضائے مصلحت وقتاً فوقتاً ترمیم و تنسیخ کرتا رہا ہے۔ اسی طرح اپنے افعال میں جن کو "امور تکوینی" کہا جاتا ہے۔ وہ حسب مصلحت وقت تغیّر و تبدّل کرتا رہتا ہے۔ مثلاً زید ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ خدا نے اُس کے لیے فراغدستی اور خوشحالی متعیّن کر دی۔ لیکن جس طرح شریعتوں کو منسوخ کرنے سے پہلے وہ جانتا تھا کہ شریعت فلاں وقت منسوخ کر دی جائے گی۔ اسی طرح زید کو فراغدستی دینے سے پہلے بلکہ یوں کہیئے کہ خلقت عالم سے پہلے وہ جانتا تھا کہ فلاں وقت اس کو فراغدستی عطا کر دی جائے گی۔ اس سے خدا کی جہالت اور نادانی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ یہ ظاہر ہوتا کہ عالم تکوین میں کوئی بات اُس کی مرضی کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتی اور یہ کہ وہ خدا عالم الغیب والشہادۃ ہے اور ہر بات کو اس کے وجود سے پہلے جانتا ہے۔

لہٰذا جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ شیعہ مذہب میں مسئلہ بدا بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا کو بداء ہوتا ہے یعنی خدا (معاذ اللہ) بعض اوقات اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایک کام کرتا ہے اور پھر پچھتاتا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس عقیدہ کو انتہائی ضروری بھی سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی صحت علم کے لیے یہ بتا دینا بہت ضروری ہے کہ جس طرح حسب تقاضائے وقت و مصلحت امور تشریعی میں تغیّر و تبدل کرنے کا نام نسخ ہے۔ اسی طرح حسب تقاضائے مصلحت امور تکوینی میں تغیّر و تبدل کرنے

کا نام بداء ہے اور یہی مقصد شیخ مفیدؒ کے اس قول کا ہے کہ۔

میں معنی بداء کے متعلق وہی کہتا ہوں جو تمام مسلمان نسخ اور اسی قسم کے امور کے متعلق کہتے ہیں مثلاً۔ غنی کے بعد فقیر بنا دینا یا صحت مند رکھنے کے بعد مریض کر دینا یا زندہ کرنے کے بعد موت دے دینا یا قائلین عدل کے عقیدہ کے مطابق، اعمال کے حسن و قبح کی بنا پر عمر یا رزق وغیرہ میں کمی زیادتی کر دینا کہ انہی چیزوں کا نام ہم بداء رکھتے ہیں۔ (اور ان باتوں کے سب لوگ قائل ہیں۔ لہٰذا عام مسلمانوں اور شیعوں میں اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔)

عقیدہ بداء کیوں؟

اس مسئلہ پر ساری بحث اپنی جگہ درست سہی لیکن جب لفظ بداء کے ایک معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ ایک ارادہ سے دوسرے ارادہ کی طرف پلٹنا، کسی چیز کے متعلق نیا علم باطن حاصل ہونے کی بنا پر اور اس معنی کے اعتبار سے لفظ بداء کا استعمال خداوند عالم کے حق میں جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور یہ عقیدہ لازم آئے گا کہ خداوند عالم کو ایسی چیز کا علم ہوتا ہے جو پہلے نہیں تھا تو پھر لفظ بداء کا استعمال کیوں کیا جاتا ہے ایک متفقہ عقیدہ کو صرف لفظ بداء کے استعمال کی وجہ سے متنازعہ کیوں بنایا جاتا ہے۔

مولانا محترم "وجہ تسمیہ" کے عنوان کے تحت اس بات کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"اب صرف اتنی سی بات اور رہ جاتی ہے کہ خدا کی قدرت اور علم سے متعلق اس عقیدہ کو بداء کیوں کہتے ہیں؟ تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرآن اور احادیث میں اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا ہم بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ خداوند عالم نے اس عالم کے انتظام کے لیے فرشتوں کو موکّل کیا ہے اور ان کو قبل از وقت ان سے متعلق تمام باتوں کا علم (مجملاً اور مشروط) عطا کر دیا ہے۔ اسی طرح اپنے خاص بندوں کو بھی۔ لیکن اُس نے جن فرشتوں کو اس تدبیر عالم اور تصرفات ارضیہ و سماویہ پر متعین کر رکھا ہے وہ ہر وقت اس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں اور پہلے سے نہیں جانتے کہ کس وقت اس کی مشیت اور مصلحت کیا ہوگی اگرچہ ان کو اجمالی اور مشروط علم ان امور کا عطا کر دیا گیا ہے جو ان سے متعلق ہیں۔ پھر بھی آخری اور قطعی فیصلہ سے یہ باخبر نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر حیات و

موت کے مسئلہ کو لے لیجئے۔ خدا زید کو پیدا کرتا ہے مگر ملک الموت اس بات سے قطعی باخبر نہیں ہے کہ اس کی عمر چالیس ۴۰ برس کی ہے یا پچاس ۵۰ برس کی ہے یا ساٹھ ۶۰ برس کی ہے۔ اس کو بس اس قدر بتایا جاتا ہے کہ اس کی عمر بمقتضائے حکمت پچاس ۵۰ سال ہے۔ لیکن اگر یہ اپنے اقربا کے ساتھ بدسلوکی کرے گا اور قطع رحم کا مرتکب ہوگا تو اس کی عمر میں دس ۱۰ سال کم کر کے چالیس سال کر دی جائے گی اور اگر اس نے صلۂ رحمی اختیار کی تو اس کی عمر میں دس ۱۰ سال کا اضافہ کر کے ساٹھ ۶۰ سال کر دی جائے گی۔ اب ملک الموت یہ نہیں جانتا کہ زید کی روح کب قبض کی جائے گی۔ لیکن خداوند عالم جو عالم الغیب والشہادۃ ہے وہ زید کا کیا ذکر ہے کہ عالم کی خلقت سے پہلے بھی جانتا تھا کہ زید صلۂ رحمی کرے گا اور اس کی عمر ساٹھ ۶۰ سال ہوگی۔

ملائکہ اور خاصان خدا کا علم ہمیشہ مشروط ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ انھیں ہر شرط کی خبر پہلے سے دے دی جائے۔ اگر مصلحت ہوتی ہے تو شرط پہلے ہی ظاہر کر دی جاتی ہے ورنہ اس کو عین وقت پر ظاہر کیا جاتا ہے (بجز ان خبروں کے جن کے بارے میں وہ صراحتہً خود بتا دے کہ اس میں کوئی شرط نہیں ہے اور یہ حکم قطعی ہے) اور شرط کے پورا ہونے یا نہ ہونے کی بنا پر ان ملائکہ یا خاصان خدا کے علم میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن خدا تو ہمیشہ سے آخری نتیجہ اور اپنے آخری حکم کو جانتا ہے۔ اُس کے علم میں تبدیلی کبھی نہیں ہوتی اور وہ یہی چیز ہے جس کو خدا نے یوں فرمایا ہے۔

جو کچھ خدا چاہتا ہے محو فرماتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثابت فرماتا ہے (لکھ دیتا ہے بتا دیتا ہے) اور اُسی کے پاس اصل کتاب ہے۔"

(سورۃ الرعد)

یہاں وہ علم جس میں محو و اثبات ہوتا رہتا ہے اس سے ملائکہ اور خاصان خدا کا علم مراد ہے جس کو لوحِ محو و اثبات کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے اور وہ ام الکتاب یا اصلی کتاب جو خدا کے پاس ہے۔ اس سے خود خداوند عالم کا علم مراد ہے۔ جس میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا اور اسی کو "لوح محفوظ" کہتے ہیں۔

"بلکہ یہ بزرگ قرآن ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔"

(سورۃ البروج)

اس آیت میں لوح محفوظ سے وہی ناقابلِ تغیّر علم مراد ہے جس کو علم الٰہی کہا جاتا ہے۔

لہٰذا ملائکہ یا خاصان خدا کو گزشتہ معلومات کی بنا پر جو توقع قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن جب حکم الٰہی اور فیصلہ اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے تو اس کو شیعوں کی اصطلاح میں بدار کہتے ہیں۔ کیوں کہ بدار کے معنیٰ ظہور کے ہیں اور یہاں بھی توقع کے خلاف امر کا ظہور ہوتا ہے۔

لفظ بدار کے استعمال کے سلسلہ میں جس نظریہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ وہ سراسر ایک دعویٰ ہے اور دعویٰ بغیر دلیل کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ چنانچہ مولانا محترم نے اپنے اس دعویٰ کو پختہ کرنے کے لیے دلیلیں فراہم کی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں۔

اوّل ۔ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ تم کوہ طور پر آکر تیس ۳۰ دن روزے رکھو تو تم کو توریت عطا کی جائے گی۔ حضرت موسیٰ اس وعدہ کے مطابق کوہ طور پر گئے اور تیسوں دن روزے رکھے تیسویں ۳۰ دن مسواک کر کے کوہ طور گئے ان کو اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ تیس ۳۰ دن کا یہ تعین اس شرط پر ہے کہ مسواک نہ کی جائے۔ وہاں جاتے ہی حکم ہوا کہ روزہ دار کی منہ کی بو میرے نزدیک مشک وغیرہ کی خوشبو سے زیادہ ہے اس لیے تم مزید دس ۱۰ روزے رکھو اور بغیر مسواک کیے ہوئے آؤ تو توریت ملے گی

چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اس ارشاد الٰہی کی تعمیل میں مزید دس ۱۰ روزے رکھے اور چالیس ۴۰ دن پر توریت ملی۔ قرآن میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

"اور ہم نے موسیٰؑ سے تیس ۳۰ راتوں کا وعدہ کیا اور مزید دس ۱۰ راتوں سے اس کو اور کامل کیا۔ بس اس کے رب کا مقرر کیا ہوا وقت یعنی چالیس ۴۰ راتیں پوری ہو گئیں"

(سورۃ الاعراف)

اس تغیّر میں ایک حکمت اور بھی پوشیدہ تھی اور وہ تھی بنی اسرائیل کا امتحان لینا۔ چنانچہ مولانا موصوف اس واقعہ پر اپنی بحث کو مکمل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ سے یہ پہلے ہی کہہ دیا گیا ہوتا کہ تمہیں تیس ۳۰ یا چالیس ۴۰ دن میں توریت ملے گی یا یہ کہ تیسویں ۳۰ دن بغیر مسواک کیے ہوئے آؤ گے تب توریت ملے گی یا یہ کہ چالیس ۴۰ دن روزے رکھ کر بغیر مسواک کیے ہوئے آؤ گے تو توریت ملے گی تو بنی اسرائیل کا امتحان کیوں کر ہوتا؟

امتحان تو صرف اسی طرح ممکن تھا کہ اولاً صرف تیس ۳۰ دن ظاہر کیے گئے اور اس کی شرط جس پر توریت کا ملنا متعلق تھا۔ پوشیدہ رکھی گئی۔ اب جب حضرت موسیٰؑ نے اپنے طور پر اس شرط کو پورا نہ کیا تو دس ۱۰ دن کی مدت اور بڑھ گئی۔ اب یہ دس ۱۰ دن کا اضافہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل دونوں کی توقع کے خلاف تھا۔

دوم ۔ حضرت یونس علیہ السلام قرآن پاک کی تصریح کے مطابق ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ افراد کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ مدّتوں کی جد و جہد اور تبلیغی کاوشوں کے بعد صرف دو ۲ آدمی ایمان لائے۔ ان میں ایک عابد خشک تھا اور دوسرا عالم تھا۔ عرصۂ دراز تک تبلیغ کر کے جب حضرت یونس مایوس ہو گئے تو اپنی قوم کے لیے بددعا کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہوا کہ فلاں روز ان پر عذاب آئے گا۔ حضرت یونسؑ نے پھر سب کو ڈرایا اور اس کے بعد اپنے علاقہ سے نکل گئے۔ عابد ان کے ساتھ تھا۔

حضرت یونسؑ کے چلے جانے کے بعد اس عالم نے جو ایمان لا چکا تھا۔ اپنی قوم کو جمع کیا اور ان کو سمجھایا بجھایا۔

مقررہ دن عذاب الٰہی ایک گہرے سیاہ بادل کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس عالم کی ہدایت کے بموجب قوم یونسؑ نے بچّوں کو ماؤں سے علیحدہ کر دیا۔ بوڑھے بچے سب کے سب استغفار کرتے، روتے، گڑگڑاتے میدان میں نکل آئے اور صدق دل سے ایمان لائے۔ آخر سروں پر آیا ہوا عذاب رحمت الٰہی سے ٹل گیا اور لوگ محفوظ رہ گئے۔ اس واقعہ کو قرآن پاک نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"کوئی ایسا قریہ نہیں جو (آخری وقت میں) ایمان لایا ہو اور اُس کے ایمان نے اس کو نفع پہنچایا ہو، بجز قوم یونس کے کہ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے حیات دنیا میں رسوائی کے عذاب کو دور کر دیا اور اُن کو ایک مدّت تک حیات سے بہرہ اندوز رکھا۔" (سورہ یونس)

اس واقعہ میں اصل شرط مخفی رکھنے کی مصلحت بالکل واضح ہے۔ اگر حضرت یونسؑ پر یہ ظاہر کر دیا جاتا کہ قوم پر عذاب آ کر ٹل جائے گا۔ تو ان کے انداز اور تہدید اور ڈرانے میں وہ شدّت اور زور باقی نہ رہتا اور نتیجہ یہ ہوتا کہ قوم والوں پر اثر نہ ہوتا اور پھر سب کا عذاب میں مبتلا ہونا یقینی ہو جاتا۔ اس لیے خدا نے عذاب بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن اس کی یہ شرط کہ اگر وہ لوگ ایمان نہ لائیں گے تب عذاب میں مبتلا ہوں گے اور ایمان لانے پر عذاب ہٹا لیا جائے گا۔ اس کو پوشیدہ رکھا۔ اس کا بہترین نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم مومن ہو گئی

اور عذاب الٰہی سے بچ گئی۔

سوم ۔ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو خواب میں یہ حکم دیا کہ اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو ذبح کر دو اور جب وہ قربانی کرنے گئے تو حضرت اسمٰعیلؑ کو ہٹا کر ایک دنبہ کو ان کا فدیہ بنا دیا گیا۔ اس خواب میں اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ آخری منظر بھی دکھایا جاتا کہ حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنا چاہا تو دنبہ فدیہ ہو گیا تو پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے خلوص قلب، ثبات قدم اور تسلیم و رضا کا امتحان کیوں کر ہوتا؟ اس لیے اصل حکم تو ظاہر کر دیا گیا لیکن آخری انجام کو ان حضرات سے پوشیدہ رکھا گیا تاکہ تسلیم و رضا کا امتحان پوری طرح ہو جائے۔ جب ہی تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو یہ سند عطا کی کہ۔

"ہم نے ان کو آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ اور ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں"

اس واقعہ میں بھی وعدہ اور حکم کی شرط اور انجام کو نہیں بتایا گیا۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے یہی سمجھا کہ اسماعیلؑ ضرور قربان کر دیے جائیں گے اور جب اُن کی توقع کے خلاف سامنے آیا تو اُن پر یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ حکم دراصل مشروط یا معلق تھا یا یہ وعدہ بعض شرائط پر مبنی تھا۔ اسی لیے یہ نتیجہ برآمد ہوا۔

اب آپ دیکھئے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں۔

ان سارے واقعات میں کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خدا بھی انجام سے بے خبر تھا وہ عالم الغیب والشہادہ ہے۔ وہ عالم کی ابتدا کو عالم کی ابتدا سے قبل سے جانتا ہے۔ البتہ بندے اُس کی مصلحت کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ اس وجہ سے جب وہ کسی بات کی توقع ذات الٰہی سے رکھتے ہیں اور وہ بات اسی طرح نہیں ہوتی یا اُس کے خلاف ظاہر ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ بدار (ظہور) واقع ہوا یعنی ہم پر خدا کی وہ مصلحت یا بات ظاہر ہوئی جس کی پہلے سے توقع نہیں تھی۔

مولانا موصوف آگے لکھتے ہیں۔

میری ان ساری تشریحات سے یقیناً یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ بدار کا تعلق علم الٰہی سے نہیں بلکہ بندوں کے علم سے ہے اور تغیّر و تبدّل اللہ کے علم میں نہیں بندوں کے علم میں ہوتا ہے۔ اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ بدار کا مفہوم یہ ہے کہ خدا (معاذ اللہ) بعض اوقات اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایک کام کرتا ہے اور پھر پچھتاتا ہے تو بالکل غلط ہے بلکہ بدار کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے علم کی کُنہ اور گہرائیوں تک بندے

کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

عقدہ کشائی

مولانا سیّد سعید اختر صاحب نے اپنا یہ مضمون تمام کرتے ہوئے ایک بہت ہی پتہ کی بات لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرات اہل سنت بھی مذکورہ بالا عقائد میں شیعوں کے مطابق ہی عقیدہ رکھتے ہیں البتہ وہ اس عقیدہ کا نام بداء نہیں رکھتے اور یہ صرف لفظی اختلاف ہے لیکن حقیقت اپنی جگہ یکساں ہے۔

اس کے بعد مولانا موصوف بطور دلیل لکھتے ہیں کہ سنیوں کے مشہور عالم امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں آیت یمحوا اللہ ما یشاء ویثبت کی تفسیر میں لکھا ہے۔

"اس آیت کے بارے میں دو قول ہیں ایک کہ ہر امر کے متعلق عام ہے جیسا کہ ظاہر الفاظ اس کے مقتضی ہیں اور خدا رزق کو محو کرتا ہے اور بڑھاتا ہے۔ اسی طرح موت سعادت شقاوت اور ایمان و کفر کے متعلق ان لوگوں کا خیال ہے کہ خدا اس کو ثابت بھی کرتا ہے اور مٹاتا بھی ہے۔ یہ عمر و بن مسعود صحابی رسولؐ کا مذہب ہے اور جابر بن عبداللہ انصاری نے بھی رسولؐ سے اس کی روایت کی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ محو و اثبات خاص خاص چیزوں میں ہوتا ہے۔ اب ان خاص چیزوں کے تعیّن میں کئی صورتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس محو و اثبات سے پہلے حکم کا منسوخ کرنا اور اس کے بدلے میں نیا حکم دینا مراد ہے.... آٹھویں یہ کہ اس سے رزق اور محنت و مصیبت کا محو و اثبات مراد ہے کہ خدا اس کو کتاب میں لکھتا ہے۔ پھر دعا اور صدقہ کے ذریعہ اس کو مٹا دیتا ہے اور اس طرح انسان خدا کی طرف لو لگانے پر ابھارا جاتا ہے .... دسویں یہ کہ وہ اپنے جس حکم کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور اس پر کوئی مطلع نہیں ہوتا۔ بس وہی اپنے حکم کا تنہا مالک ہے۔ جس طرح چاہے حکم دے اور وہی پیدا کرنے، معدوم کرنے، زندہ کرنے موت دینے، غنی کرنے اور فقیر بنا دینے کا مختار مطلق ہے۔ اس حیثیت سے کوئی مخلوق اس کے غیب پر مطلع نہیں ہو سکتی۔"

اس تفسیری نوٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا موصوف لکھتے ہیں۔

امام رازی نے جو اہل سنّت کے عقائد تحریر کیے ہیں۔ ان کو شیخ مفید کے ان الفاظ سے ملایئے جو انھوں نے بداء کی تشریح میں لکھے ہیں۔

"میں بداء کے معنی وہی کہتا ہوں جو تمام مسلمان نسخ وغیرہ کے متعلق کہتے ہیں۔ مثلاً غنی کرنے کے بعد فقیر بنادینا، صحت مند رکھنے کے بعد مریض کردینا، زندہ کرنے کے بعد مار ڈالنا اور اہل عدل کے عقیدہ کے مطابق عمر اور رزق میں اعمال کے مطابق کمی بیشی کرنا۔"

لفظی بحث سے قطع نظر بنیادی طور پر اہل سنت اور شیعوں کے عقیدے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف سمجھنے اور سمجھانے کی بات ہے

مولانا موصوف نے آگے لکھا ہے۔

اسی طرح علامہ زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں آیت۔ **وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتٰب** کے تحت لکھتے ہیں۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم کسی انسان کی عمر نہ بڑھاتے ہیں نہ گھٹاتے ہیں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً لوح میں لکھا ہے کہ اگر فلاں شخص حج کرے یا جہاد کرے تو اس کی عمر چالیس ۴۰ برس ہے اور اگر حج اور جہاد دونوں کرے تو اس کی عمر ساٹھ ۶۰ سال ہے۔ بس اگر وہ دونوں کام کرے اور اس طرح ساٹھ ۶۰ سال تک پہنچ جائے تو گویا اُس نے پوری عمر پائی اور اگر صرف ایک ہی کام کیا اور اس طرح چالیس ۴۰ سال سے آگے نہ بڑھا تو اس کی عمر اپنی آخری حد یعنی ساٹھ ۶۰ سال سے گھٹ گئی اور اس امر کی طرف رسول اللہ نے اپنے اس قول میں اشارہ کیا ہے کہ صدقہ اور صلۂ رحم شہروں کو آباد کرتے ہیں اور عمر کو بڑھاتے ہیں۔"

اسی طرح قاضی بیضاوی اپنی مشہور تفسیر بیضاوی میں آیت مذکورہ بالا کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے کہ ایک ہی شخص کی عمر میں زیادتی اور کمی بہت سے اسباب کی بنا پر ہوتی ہے۔ جن کو خدا نے کتاب میں لکھ دیا ہے۔ مثلاً اس میں یوں ہو کہ اگر عمر حج کرے تو اس کی عمر ساٹھ ۶۰ سال ہوگی ورنہ چالیس ۴۰ سال ہوگی۔"

اس طویل گفتگو سے اب یقیناً یہ عقدہ کھل ہی گیا ہوگا کہ ہم نے صرف لفظی اختلاف کو آڑ بنا کر جو آپس میں زبردست مخاذ آرائی کی ہے۔ اُس کی کیا حقیقت ہے۔ تمام مسلمان (شیعہ و سنی) اس امر کے قائل ہیں کہ خدا خلق کے امور میں محو و اثبات کرتا رہتا ہے اور وقتاً فوقتاً مناسب مصلحتِ وقت جدید احکام دیتا رہتا ہے۔ اور اسی کو شیعہ حضرات بداء کہتے ہیں۔

"اسلامی تاریخ شیعہ وسنّی کے اختلافات اور فکری وسیاسی تنازعات پر مشتمل ہے۔ صلیبی جنگوں سے آئی ہوئی افکار آج تک مسلمانوں کو لڑانے کے لیے کام کر رہی ہیں تاکہ عالم اسلام میں اتحاد قائم نہ رہے۔ شیعہ وسنّی کے درمیان ہونے والے تمام اختلافات کے پس پشت اہل مغرب کی تحریک کارفرما تھی۔ اب شیعہ وسنّی نے دشمنوں کی سازش پہچان لی ہے۔ اور اختلافات کا دائرہ تنگ کرنے کے لیے آپس میں مصروف عمل ہیں۔ اب انھیں معلوم ہوگیا ہے کہ ناجائز فتنوں سے کسے فائدہ پہنچ رہا ہے۔"

("الاسلام وحرکتہ التاریخ" از: مفکر اسلام انوار الجندی)

مُتعہ

(عقدِ وقتِ مُقرّرہ)

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو یقیناً نظری ہے اور غالباً اس پر عام طور سے ایک فی صدی بھی عمل نہیں ہوتا ہے۔ لیکن طرفین کے نزدیک یہ ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے لیکن مخالف اسے ذرا بھی جائز اور حلال سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس کی حمایت کرنے والے حضرات اسے پورے یقین اور اعتماد کیساتھ جائز اور حلال سمجھتے اور جانتے ہیں۔

علامہ سیدؒ مودودیؒ دور جدید کے علماء میں ایک وسیع فکر و نظر کے حامل اور انتہائی متوازن طبیعت کے مالک تھے اور انھوں نے بہت سے متنازعہ مسائل میں اعتدال کی روش اختیار کی ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں وہ بھی اُلجھ کر رہ گئے۔

علامہ سید مودودیؒ نے سورہ مومنون آیت ۵، ۶ پر پہلی بار تفسیر کی نوٹ اس طرح تحریر کیا۔

"بعض لوگوں نے متعہ کی حرمت بھی اس آیت سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ ممنوعہ عورت نہ تو بیوی کے حکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حکم میں، لونڈی تو وہ ظاہر ہے کہ نہیں ہے اور بیوی اس لیے نہیں ہے کہ زوجیت کے لیے جتنے قانونی احکام ہیں ان میں سے کسی کا بھی اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ وہ نہ مرد کی وارث ہوتی ہے اور نہ مرد اس کا وارث ہوتا ہے۔ نہ اس کے لیے عدت ہے نہ طلاق، نہ نفقہ ہے نہ ایلا اور ظہار و لعان وغیرہ بلکہ وہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی مستثنیٰ ہے پس جب وہ بیوی اور لونڈی دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ان کے علاوہ "کچھ اور" میں شمار ہوگی۔ جس کے طالب کو قرآن حد سے گزر جانے والا قرار دیتا ہے۔"

"لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت تحریم کے بارے میں صریح نہیں ہے اور اس سے تحریم پر استدلال ان ثابت شدہ احادیث کے بھی خلاف ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم نے فتح مکہ کے زمانہ میں اس کو حرام قرار دیا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حرمت متعہ کا حکم قرآن کی اس آیت میں آچکا تھا اور یہ

ہجرت سے کئی سال پہلے نازل ہوئی تھی تو کیسے تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے فتح مکہ تک جائز رکھتے۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ متعہ کی حرمت قرآن کے کسی صریح حکم نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر مبنی ہے۔ سنّت میں اس کی صراحت نہ ہوتی تو محض اس آیت کی بنا پر تحریم کا فیصلہ کر دینا مشکل تھا۔

"متعہ کو مطلقاً حرام قرار دینے یا مطلقاً مباح ٹھہرانے میں سنّیوں اور شیعوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس میں بحث و مناظرے نے بے جا شدّت پیدا کر دی ہے۔ ورنہ امر حق معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ انسان کو بسا اوقات ایسے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ جس میں نکاح ممکن نہیں ہوتا اور وہ زنا یا متعہ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں زنا کی نسبت متعہ کر لینا بہتر ہے۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور
ماہ اگست ۱۹۵۵ء)

موقف میں تبدیلی

لیکن جب انتہا پسندوں کی جانب سے اس تفسیری نوٹ پر شدت کا روّیہ کا اختیار کیا گیا تو اس تفسیری نوٹ کو تفہیم القرآن جلد سوم تفسیری نوٹ نمبر ۷ ذیلی نوٹ ۴۷ میں اس طرح تبدیل کر دیا ہے۔

بعض لوگوں نے متعہ کی حرمت ۔۔۔۔ فیصلہ کر دینا مشکل تھا ۔۔۔ جوں کا توں لکھنے کے بعد آگے لکھا ہے۔

"متعہ کا جب ذکر آگیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں کی اور توضیح کر دی جائے۔

اوّل یہ کہ اس کی حرمت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اسے حضرت عمرؓ نے حرام کیا ہے درست نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ اس حکم کے موجد نہیں تھے بلکہ اسے صرف شائع اور نافذ کرنے والے تھے۔ چوں کہ حضورؐ نے یہ حکم اپنے آخری زمانہ میں دیا تھا اور عام لوگوں تک نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اس کی عام اشاعت کی اور بذریعہ قانون اسے نافذ کیا۔

دوم یہ کہ شیعہ حضرات نے متعہ کو مطلقاً مباح ٹھہرانے کا جو مسلک اختیار کیا ہے تو اس کے لیے تو بہر حال نصوص قرآن و سنّت میں سرے سے گنجائش ہی نہیں ہے۔ صدر اوّل میں صحابہ اور تابعین اور فقہا میں سے چند بزرگ جو اس کے جواز کے قائل تھے۔ وہ اسے صرف اضطرار اور شدید ضرورت کی حالت میں جائز رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اسے نکاح کی طرح مباح مطلق اور عام حالات میں معمول بنا لینے کا قائل نہ تھا۔

ابن عباس جن کا نام قائلین جواز میں سب سے زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اپنے مسلک کی توضیح خود ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ یہ تو مردار کی طرح ہے کہ مضطر کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں۔ اور اس فتویٰ سے بھی وہ اس وقت باز آ گئے تھے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اباحت کی گنجائش سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ متعہ کرنے لگے ہیں اور ضرورت تک اسے موقوف نہیں رکھتے۔ اس سوال کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ ابن عباسؓ اور ان کے ہم خیال چند گنے چنے اصحاب نے اس مسلک سے رجوع کر لیا تھا یا نہیں۔ تو ان کے مسلک کو اختیار کرنے والا زیادہ سے زیادہ جواز بحالت اضطرار کی حد تک جا سکتا ہے مطلق اباحت اور بلا ضرورت تمتع حتیٰ کہ منکوحہ بیویوں کی موجودگی میں بھی ممنوعات سے استفادہ کرنا تو ایک ایسی آزادی ہے جسے ذوق سلیم بھی گوارہ نہیں کرتا کجا کہ اسے شریعت محمدیہ کی طرف منسوخ کیا جائے اور ائمہ اہل بیت کو اس سے متہم کیا جائے ....."

دیکھا آپ نے علامہ سید مودودیؒ کس طرح اس مسئلہ میں الجھ گئے اور اس تبدیل شدہ موقف میں کئی کمزوریاں راہ پا گئیں۔ لیکن ہمیں نہ تو کسی کی کمزوریوں پر اس وقت گرفت کرنا ہے اور نہ خود الجھنا ہے اور نہ دوسروں کو الجھانا ہے۔ ہمارا طریقہ تو اب تک یہ رہا ہے کہ متنازعہ مسائل میں ادھر اُدھر سے بچ کر کسی بھی مسئلہ پر اُس کی تائید کرنے والے حضرات کی بات سنی اور سمجھی جائے۔ لہٰذا اس موقع پر بھی ہم یہی اصولی طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔

آیتِ قرآن سے استدلال

متعہ کے مسئلہ پر ہمارے مطالعہ میں کئی اچھی اچھی کتابیں آئی ہیں اور حسب ضرورت ان سبھی کتابوں سے ہم استفادہ بھی کریں گے لیکن ابتداء حضرت حجۃ الاسلام مولانا سیّد مرتضیٰ حسین صاحب کی کتاب "متعہ اور قرآن" سے کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب میں پیش لفظ کے بعد "قلت و کثرت ایک سماجی مسئلہ" کے عنوان کے تحت۔ نظریات کا تصادم، سامراجیوں کی جنگ اور اسلام، اسلام کی نظر میں پہلے گھر کا نظام، عائلی زندگی، ازدواج، احترام زن، بے شوہر عورت، ازدواج کا فلسفہ، جنسی عمل اور عائلی زندگی کے چار ذرائع۔ متعہ کی حقیقت فقہ میں، کنیز کی، دفاع اور جہاد پر بہت مناسب انداز میں گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد انھوں

نے متعہ کے لیے قرآن کریم سے سند حاصل کی ہے۔

"شوہر والی عورتیں حرام ہیں مگر وہ عورتیں جو تمہارے قبضہ میں آجائیں اللہ کا یہ تم پر حکم ہے اور ان کے سوا سب عورتیں جائز ہیں۔ بشرطیکہ بدکاری کے لیے نہیں بلکہ پاک دامنی کے ساتھ، اپنے مال کے بدلے نکاح کرنا چاہو۔ ہاں جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا انھیں متعین کیا ہوا مہر ادا کر دو اور مقررہ مدت تمام ہونے کے بعد اگر تم باہمی رضامندی سے کچھ طے کر لو تو کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ خوب اچھی طرح باخبر اور مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔"

(سورہ نساء آیت ۲۴)

حضرت مولانا مرحوم نے پہلے اس آیت کے مفہوم پر لغت صرف و نحو کے مطابق بحث کی ہے اور پھر اس آیت کا منشا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

دائمی طور پر حرام عورتوں کا حکم بیان کرنے کے بعد ان عورتوں کا حکم آرہا ہے جو عارضی طور پر حرام ہیں۔

۱۔ کسی عورت کے حبالۂ عقد میں لانے کے بعد اس کی بہن کے ساتھ عقد باطل ہے۔ دو بہنیں ایک ساتھ ایک شخص کی زوجیت میں نہیں آسکتیں۔

۲۔ شوہر دار عورتیں دو قسم کی ہیں۔ پہلے وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کے ساتھ ہیں، دوسری وہ عورتیں جو کافر شوہروں کے عقد میں تھیں اور غزوہ و جہاد میں قید ہو گئیں۔ پہلی قسم کی عورتوں سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ جب تک پہلا شوہر طلاق نہ دے دے۔ دوسری قسم کی عورتوں سے ایک طہر یا وضع حمل کے بعد بطور کنیز تعلقات جنسی جائز ہیں۔

اُحِلَّ لکم ماوراء ذالکم۔ بیان شدہ عورتوں کے علاوہ، عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ لیکن حلال کا مطلب، عیاشی و بدمستی ہرگز نہیں بلکہ زن و مرد کو عفت و پاک دامنی و حیا کا خیال رکھنا چاہیئے۔

مزید شہادتیں

فما استمتعتم بہ منھن یعنی ان میں سے جن کے ساتھ تم متعہ کرو۔ فاتوھن اجورھن فریضۃ" تو ان کے مہر جو مقرر (فرض و واجب) ہوں وہ انھیں ادا کرو۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ مقررہ مہر کے بعد تم دوبارہ سمجھوتہ کرلو یعنی مدّت تمام ہونے کے بعد تم دوبارہ متعہ یا نکاح دائمی کرلو۔ متعہ دراصل عقد دائم اور کنیزی کے درمیان ایک قانونی جواز ہے۔"

سورہ نساء کی اس آیت پر مولانا سیّد سعید اختر صاحب رضوی نے یہ گفتگو کی ہے۔

اس آیت کے انداز بیان سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس میں پہلے پہل متعہ کے جواز نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ یہ حکم دینا مقصود ہے کہ حرام عورتیں فلاں فلاں ہیں۔ اور ان میں شوہر دار عورتیں بھی داخل ہیں۔ البتہ جو شوہر دار عورتیں تمہاری کنیزی میں آجائیں تو وہ تمہارے لیے جائز ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ضمناً متعہ کے متعلق ایک خاص حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر تم فلاں عورتوں میں سے کسی عورت سے متعہ کرو تو اس کا مہر فوراً ادا کر دو۔ کیوں کہ نکاح دائمی میں تو اس کی گنجائش ہے کہ اگر زوجہ راضی ہو تو بعد میں مہر دیا جا سکتا ہے۔ جس کو مہر موجل کہتے ہیں۔ مگر متعہ میں یہ سہولت نہیں دی جا رہی ہے۔

البتہ بعد میں یہ اختیار دیا جا رہا ہے کہ تم دونوں راضی ہو جاؤ تو مہر کی مقدار یا مدّت متعہ میں کمی بیشی کر سکتے ہو۔

بہر حال یہ آیت متعہ کے حکم کی توثیق کر رہی ہے اور بجز دو تابعین کے تمام علماء اور مفسرین چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنّی۔ اس آیت کو متعہ سے متعلق سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا موصوف نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کئی سنی علماء کی تحریریں نقل کی ہیں۔

علامہ بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل جلد اوّل میں لکھتے ہیں۔

علماء نے اس آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ حسن اور مجاہد کا قول ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم نے جن عورتوں سے نکاح کر کے جسمانی تلذّذ حاصل کیا ہے کہ ان کو ان کی اجرت یعنی مہر دے دو اور باقی علماء کا یہ خیال ہے کہ اس نکاح سے متعہ مراد ہے۔

امام فخر الدین رازی نے اس آیت کی تفسیر میں بڑی وضاحت سے گفتگو کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

جو لوگ متعہ کے جائز ہونے کے قائل ہیں وہ اس آیت سے کئی طریقوں سے استدلال کرتے ہیں۔ پہلی دلیل یہی آیت ہے کہ ان تبتغوا باموا لکم محصنین غیر مسافحین فما استمتعتم بہ منھن فاتوھن اجورھن" اور اس آیت سے استدلال کے دو طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ اس آیت میں نکاح دائم اور نکاح متعہ دونوں داخل ہیں۔ کیوں کہ خدا کا یہ فرمان کہ "تم اپنے اموال کے ذریعہ عورتوں کو چاہو" اس میں دونوں صورتیں داخل ہیں۔ خواہ کوئی بغیر تعین مدّت کے عورت کو رکھنا چاہے خواہ ایک متعین مدّت کے لیے چاہے اور جب یہ دونوں صورتیں اس میں داخل ہیں تو خدا کا یہ ارشاد کہ "تمہارے لیے محرمات کے علاوہ دوسری عورتیں حلال کی گئیں کہ تم اپنے اموال کے ذریعہ سے ان کو چاہو" دونوں قسموں (نکاح دائم اور نکاح متعہ) کے حلال ہونے کا مقتضی ہے یعنی متعہ بھی نکاح دائم کی طرح حلال ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ یہ آیت صرف نکاح متعہ کے لیے نازل ہوئی ہے نکاح دائم سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں ہے اور اس کا بیان کئی وجہوں سے ہو سکتا ہے۔

پہلی وجہ وہ روایت ہے کہ ابی بن کعبؓ (جو قاریوں کے سردار اور برگزیدہ صحابی رسول تھے) اس آیت میں الی اجل مسمّٰی بڑھا کر پڑھتے تھے"، یعنی تم ان میں سے جس عورت سے ایک معین مدّت کے لیے متعہ کیا ہو اس کا مہر فوراً ادا کر دو" اور عبداللہ ابن عباس رضؓ بھی اس آیت کو یوں ہی پڑھا کرتے تھے اور اُمت اسلامی نے ان دونوں کی اس قرأت کو غلط نہیں سمجھا۔ گویا اس اُمت نے اس قرأت کی صحت پر اجماع کر لیا اور جب اس قرأت کی صحت پر اجماع ثابت ہے تو متعہ کا جواز بھی ثابت ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں صرف یہی ذکر ہے کہ تمہارے لیے یہ حلال ہے کہ تم اپنے اموال کے ذریعہ ان کو چاہو۔ اور اس کے بعد خدا نے استمتاع کے بعد ان کا مہر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ صرف اموال کے ذریعہ ان کو چاہنا تعلقات کو جائز کر دیتا ہے اور یہ صورت صرف نکاح متعہ میں ہوتی ہے"۔

مولانا موصوف مزید لکھتے ہیں کہ اس استدلال کے بعد علامہ فخرالدین رازی نے اُن حضرات کو جواب دیا ہے جو مسئلہ کو جائز نہیں سمجھتے اور آخر میں امام رازی نے یہ محاکمہ کیا ہے۔

"اور اس بحث میں جس چیز پر اعتماد کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ ہم اس کے منکر نہیں

ہیں کہ متعہ جائز تھا۔ ہم جو کہتے ہیں وہ صرف یہی کہ منسوخ ہوگیا۔ اس بنا پر اگر اس آیت سے متعہ کے جائز ہونے کا ثبوت ملتا ہے تو اس سے ہماری غرض کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔"

یعنی امام رازیؒ زیر بحث آیت پر گفتگو کرنے کے بعد اس بات سے تو مطمئن ہیں کہ اس آیت کی روح سے متعہ جائز تھا البتہ بعد میں منسوخ ہوگیا۔ اور قرآن کریم کی کسی آیت سے متعہ منسوخ ہونے کی بات ہم علامہ سیدؒ مودودیؒ کے دونوں تفسیر کی نوٹوں میں پڑھ چکے ہیں کہ متعہ قرآن کی زیر بحث آیت سے منسوخ نہیں ہوا ہے البتہ سنت نبوی سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

احادیث رسولؐ سے جواز

قرآن کریم کی آیت سے استدلال کے بعد متعہ کے قائلین نے احادیث رسولؐ سے جواز متعہ تلاش کیا ہے اور اس کے لیے اپنی رائے کے ثبوت میں متعدد احادیث نقل کی ہیں۔ ہمیں بحث و تکرار سے بچ کر سیدھے سیدھے بات کرنا ہے۔ ادھر اپنی گفتگو کو طوالت سے بھی بچانا ہے۔ اس لیے زیر بحث معاملہ میں چند منتخب احادیث رسولؐ نقل کر رہے ہیں۔ ہاں اس بات کا ضروری لحاظ رکھا ہے کہ شیعہ، سنی دونوں مکتبہ فکر کی احادیث ہمارے سامنے آجائیں۔

شیخ صدوقؒ نے حضرت امام رضا سے روایت کیا ہے کہ "متعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلال کیا اور رحلت تک حرام نہیں فرمایا۔"

امام محمد باقر نے فرمایا۔ "جابر بن عبداللہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھ ہم لوگ غزوے میں تھے آنحضورؐ نے متعہ کو حلال فرمایا اور پھر اسے حرام نہیں کیا اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر حضرت عمرؓ پیش قدمی نہ کرتے تو زنا کرتے مگر معدود چند لوگ۔"

سیدؒ مرتضیٰ حسین صاحب نے ان شیعہ روایات کے علاوہ "صحاح اہل سنت پر نظر" کے ذیلی عنوان کے تحت بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"اب اس بارے میں کتب حدیث و سنت کا مطالعہ بھی لازم ہے۔ کتب حدیث و سنت کا مطالعہ بھی لازم ہے۔ کتب حدیث میں رسالت مآب کے حکم حلت جواز پھر عدم جواز پر گفتگو موجود ہے۔ ہم اس کا جائزہ عرض کرتے ہیں۔"

پورا جائزہ خاصا طویل ہے اس لیے ہم اب بھی اختصار سے کام لیں گے۔

سلمہ بن اکوع نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو مرد و زن ساتھ رہنے پر تیار ہوں تو وہ دونوں تین راتیں گزار سکتے ہیں۔ اس کے کہ اگر دونوں پسند کریں تو اضافہ کر لیں یا جدا ہو جائیں۔

(بخاری شریف باب النکاح)

حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ غزوے میں تھے۔ آنحضرتؐ نے ہمیں ایک مدت کے لیے نکاح کی اجازت دی۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ نے یہ آیت پڑھی۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں۔ انھیں حرام نہ کر لو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔"

(سورہ المائدہ آیت ۸۷)

(روایت مسلم شریف کتاب النکاح)

اہلسنّت علماء کی ایک کثیر تعداد اس بات سے متفق ہے کہ متعہ کے جائز ہونے کے سلسلہ میں یقینی طور سے قرآن کریم اور احادیث شریف سے استدلال صحیح ہے اور ایک خاص وقت کے لیے متعہ جائز تھا۔ لیکن پھر رسول اللہؐ نے اسے باطل قرار دے دیا۔ شیعہ حضرات اس بات سے متفق نہیں ہیں اور اُن کا یہ مسلسل اصرار ہے کہ متعہ کی حرمت کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا ہے بلکہ حرمت متعہ کا حکم حضرت عمرؓ کا دیا ہوا ہے۔

اس سلسلہ میں شیعہ علماء متعدد روایات بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

محترم سیّد مرتضیٰ حسین صاحب لکھتے ہیں۔

جناب عبدالحسین، احمد امینیؒ اپنی تحقیقی کتاب "الغدیر" میں سولہ[16] واقعات نقل کیے ہیں جن کے راویان معتبر نے کتاب و سنّت کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ کے حکم کا تذکرہ کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کا حکم

ابن نضرہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ حج تمتع کا حکم دیتے اور ابن زبیرؓ اس کو منع کرتے تھے۔ میں نے اس

کا تذکرہ جابر بن عبداللہؓ سے کیا۔ انھوں نے کہا۔ یہ بات میرے سامنے ہو چکی ہے۔ ہم لوگوں نے رسول اللہ کے ساتھ حج تمتّع کیا ہے۔ پھر جب حضرت عمرؓ کا دور آیا تو انھوں نے کہا۔ اللہ اپنے رسولؐ کے لیے جو چاہتا اور جیسا چاہتا حلال کرتا۔ اب قرآن نازل ہو چکا۔ تم لوگ حج و عمرہ تمام کرو اللہ کے لیے اور "ابتوا النکاح ہذہ النساء" ان عورتوں سے نکاح ختم کر دو۔ اب ہرگز کوئی ایسا مرد میرے سامنے نہ لایا جائے گا۔ جس نے کسی عورت سے ایک مدت کے لیے نکاح کیا ہو۔ مگر یہ کہ میں اُسے پتھر مار دوں۔ سنگسار کروں گا۔"

(مسلم شریف)

عروہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ خولہ بنت حکیم حضرت عمرؓ کے پاس آئیں اور یہ تذکرہ کیا کہ ربیعہ بن اُمیہ نے ایک کم سن لڑکی سے متعہ کیا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ پس حضرت عمرؓ بن خطاب متوحش ہو کر اپنی چادر کھینچتے ہوئے باہر نکلے اور کہا کہ یہ متعہ ہے؟ اگر میں پہلے اس کی ممانعت کر چکا ہوتا تو سنگسار کر دیتا۔"

(موطا امام مالک جلد دوم)

عبدالرزّاق نے صحیح روایت کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا کہ نہیں متوحش کیا حضرت عمرؓ کو مگر ام اراکہ نے کہ وہ حاملہ ہو گئی۔ حضرت عمرؓ پوچھا یہ حمل کہاں سے آیا؟ اُس نے کہا کہ مجھ سے سلمہ بن اُمیہ نے متعہ کیا ہے اور ابوالزبیر کی روایت میں اس واقعہ کے متعلق بجائے سلمہ بن اُمیہ کے معبد بن اُمیہ کا نام ہے۔

(فتح الباری جلد نہم)

ان روایات کے سلسلہ میں مولانا سعید اختر صاحب لکھتے ہیں کہ۔

"بہر حال مذکورہ بالا واقعات میں سے جو بھی صحیح ہو۔ اس سے مجھے بحث نہیں، حقیقت صرف اتنی ہے کہ حضرت عمرؓ کو کسی خاص ناگوار واقعہ سے غصّہ آیا اور آپ نے اپنے نصف دور خلافت کے بعد متعہ کو روک دیا۔ اس سلسلہ میں اہل سنّت کے علامہ قوشجی شرح تجوید میں لکھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ منبر پر چڑھے اور کہا کہ اے لوگو! تین چیزیں عہد رسولؐ میں تھیں اور میں انھیں منع کرتا ہوں اور حرام قرار دیتا ہوں اور اس پر سزا دوں گا۔ ۱۔ عورتوں سے متعہ کرنا۔ (۲) حج تمتّع (۳) اور اذان میں حی علی خیر العمل کہنا۔"

حضرت امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں تحریر کیا ہے کہ۔

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے خطبہ میں کہا کہ متعہ الحج اور عورتوں سے متعہ کرنا عہد رسولؐ میں تھا مگر میں ان کی ممانعت کرتا ہوں۔ اور جو ایسا کرے گا۔ میں اسکو سزا دوں گا۔"

ان شہادتوں کے فراہم کرنے کے بعد مولانا سعید اختر صاحب مزید لکھتے ہیں۔

یہ تاریخی واقعات ہیں کہ جن کو کوئی اسلامی فرقہ جھٹلا نہیں سکتا اور میں نے ان کو ترتیبِ وقوع کے مطابق پیش کر دیا ہے۔ جس سے مسئلہ روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے کہ متعہ کے ناجائز ہونے کا کوئی سوال جناب خلیفہ ثانی کی خلافت کے نصف دور تک نہیں تھا۔ اور یہ متعہ کی ممانعت موصوف کا ایک ویسا ہی اعلان تھا جیسے وہ اکثر احکام برسرِ منبر بیان کرتے تھے۔

(لہذا) وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔ وہ قیامت تک حلال رہیں گی اور جن کو حرام قرار دے دیا وہ قیامت تک حرام ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ کسی اُمّتی کو خواہ وہ خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، شریعت میں تغیر و تبدل کا حق نہیں ہے وہ حضرت عمرؓ کے اعلان پر کیسے اعتبار کرے گا۔"

چنانچہ مولانا موصوف نے بطور دلیل صحیح ترمذی مطبوعہ۔ نول کشور، زاد المعاد از علامہ ابن قیم جلد اوّل کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

"ابن شہاب سے سالم بن عبداللہؓ نے بیان کیا کہ میں نے سنا کہ ایک شامی شخص نے عبداللہ بن عمرؓ سے متعہ الحج کے متعلق دریافت کیا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ حلال ہے۔ اس مرد شامی نے کہا کہ آپ کے والد نے تو اسے منع کیا ہے۔ اس پر عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا کہ اگر میرے والد نے اس سے رد کا ہے اور رسول اللہؐ اس کو بجالاتے تھے تو میرے والد کے قول کی پیروی کی جائے گی یا امر رسولؐ کی اطاعت کی جائے گی، تمہارا کیا خیال ہے؟ اس شخص نے کہا کہ نہیں بلکہ رسول اللہؐ کے حکم کی اطاعت کی جائے گی۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ روایت حسن اور صحیح ہے۔"

مسئلہ کا واحد حل

حجۃ الاسلام علامہ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے اپنی کتاب "اصل و اصول شیعہ" میں متعہ کے مسئلہ پر اپنی ساری گفتگو تمام کرتے ہوئے بعنوان "مسئلہ کا واحد حل" کے تحت لکھا ہے۔

"اب اگر ہم حقائق کی روشنی میں جائزہ لیں، معاملہ کی پوری چھان بین کریں اور اس کی تمام کڑیوں کو ملاکر صحیح نتیجہ نکالنا چاہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اپنی رائے سے متعہ کو ممنوع قرار دیا تھا۔ لیکن یہ ممانعت قطعی طور پر سماجی حالات اور وقتی تقاضوں پر مبنی تھی۔ دین و مذہب کا اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چنانچہ تواتر کے ساتھ آپ کا یہ قول نقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں دو متعہ جائز تھے مگر میں انھیں حرام قرار دیتا ہوں اور خلاف ورزی پر سزا دوں گا۔"

"یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ خلیفہ ثانی نے حرمت یا تنسیخ کے حکم کو رسالتؐ مآب کی جانب نہیں منسوب کیا بلکہ خود اپنی ذات کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ نیز سزا کا تعلق بھی اپنے آپ ہی سے رکھا۔ خدا سے کوئی واسطہ نہیں چنانچہ بہتر یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کے امتناعی حکم کو مستقل حیثیت دینے کے بجائے ایک وقتی سیاسی اور سماجی ضرورت قرار دیا جائے۔ اور یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔"

متعہ کیا ہے

ہم نے متعہ کے حلال اور حرام ہونے کے سلسلہ میں بہت سی گفتگو کر لی اور یہ بات بہرحال ہمارے علم میں آہی گئی کہ شیعہ حضرات متعہ کو جائز قرار دینے میں کسی مخالفت یا عناد کا شکار نہیں ہیں بلکہ وہ اس مسئلہ پر اپنے لیے مضبوط دلائل رکھتے ہیں۔ اس بنا پر اب ہمیں کسی نفرت یا تضحیک و توہین کے اظہار کے بجائے یہ دیکھنا ہے کہ متعہ کیا ہے اور اس کی حدود شرائط کیا ہیں۔

مولانا سیّد مرتضیٰ حسین صاحب نے اس سلسلہ میں دو بیان درج کیے ہیں۔

۱۔ شارحین صحیح بخاری کے افادات کا خلاصہ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کے الفاظ میں یہ ہے۔ متعہ ایک قسم کا نکاح ہے۔ جس میں کسی عورت کو مقدار معیّن مال سے ایک مدّت معیّن تک اپنے پاس رکھے اور ایجاب و قبول اس میں بھی شرط ہے۔ پھر اس کو رنڈی بازی کہنا فضول ہے۔

(تفسیر حقانی طبع دہلی)

۲۔ سید روح اللہ الخمینی نے تحریر الوسیلہ میں لکھا ہے۔ نکاح منقطع و متعہ اور نکاح موجل"

مسئلہ ۱۔ نکاح منقطع، دائم کی طرح ایسے عقد کا محتاج ہے جس میں ایجاب و قبول دونوں ہوں فقط

فریقین کی جذباتی رضامندی یا معاملہ بندی یا تحریر یا اشارہ کافی نہیں۔

(تحریر الوسیلہ، کتاب النکاح)

مولانا سید سعید اختر صاحب نے نکاح منقطع یا متعہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

دوسری قسم کا نکاح منقطع ہے جسے متعہ بھی کہتے ہیں۔ جس کے صیغۂ ایجاب وقبول میں ایک معین مدّت کی قید ہو۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا معاہدہ اپنی معیّن مدّت کے ختم ہونے کے بعد خود بہ خود فسخ ہو جائے گا۔

حدود، شرائط اور احکام متعہ

مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

شیخ عبدالحسین احمد امینی نے کتاب الغدیر میں فریقین کے محدثین اور فقہا کے افکار کا خلاصہ یوں لکھا ہے۔

اسلامی فرقے اصول متعہ وحدود پر متفق ہیں۔ جن کی تفصیل کتابوں میں مذکور ہے۔ اس بارے میں کبھی دو رائیں نہیں دیئیں۔

۱۔ اجر، مہر (قرآن نے متعدد بار مہر کو اجر واجور کہا ہے۔)

۲۔ مدّت۔

۳۔ عقد۔ ایجاب وقبول (معیّن صیغے میں)

۴۔ مدّت عقد گزرنے یا معاف کرنے سے جدائی۔

۵۔ عدّت

۶۔ عدم میراث۔

۷۔ درصورت اولاد، باپ کا جائز فرزند یا دختر ہونا۔

مولانا سید سعید اختر صاحب نے اس اجمال کو وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں۔

۱۔ نکاح کی دونوں قسموں میں یہ شرط اہم ہے کہ زوجہ محرمات میں سے نہ ہو، یعنی قرآن مجید نے جن عورتوں سے نکاح کو منع فرمایا ہے۔ ان میں سے نہ ہو، شوہر دار نہ ہو یا کسی پہلے شوہر کی عدّت میں نہ ہو۔ مختصر یہ کہ جن عورتوں سے نکاح دائم جائز نہیں ہے۔ ان سے متعہ بھی جائز نہیں ہے۔ چوں کہ دونوں نکاح میں دو صورتیں ہیں۔

۲۔ مہر اور ایجاب و قبول جس طرح نکاح دائم میں واجب ہے۔ اسی طرح متعہ میں بھی واجب ہے اور جس طرح مہر کی مقدار عورت اور مرد کی باہمی رضامندی پر ایک صورت میں منحصر ہے۔ اسی طرح دوسری صورت میں منحصر ہے۔

۳۔ جس طرح نکاح دائم کے بعد اگر طلاق دے دی جائے تو زوجہ کو عدّت میں رہنا واجب ہے اسی طرح متعہ کی مدّت ختم ہونے کے بعد زوجہ کو عدّت میں رہنا واجب ہے۔

۴۔ اسی طرح دونوں صورتوں میں شوہر کے انتقال کے بعد زوجہ کو ایک معیّن مدّت تک عدّت وفات میں رہنا پڑتا ہے۔

۵۔ جس طرح نکاح دائم کے بعد عورت اور مرد باہم شوہر اور زوجہ ہو جاتے ہیں اور عورت دوسرے مرد کا دل میں خیال بھی نہیں لا سکتی۔ اسی طرح متعہ کے بعد بھی عورت اور مرد باضابطہ شوہر اور زوجہ ہو جاتے ہیں اور دوسرے مرد کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتی۔

۶۔ جس طرح نکاح دائم حکم خداوندی کے مطابق عمل میں آنے کی وجہ سے سفاح (بدکاری) نہیں ہے۔ اسی طرح متعہ حکم خداوندی کے مطابق عمل میں آنے کی وجہ سے سفاح نہیں ہے۔

۷۔ جس طرح دائمی زوجہ کی اولاد باپ کی صحیح وارث ہوتی ہے۔ اسی طرح ممتوعہ زوجہ کی اولاد بھی باپ کی صحیح وارث ہوتی ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام

نکاح منقطع یا متعہ کے سلسلہ میں شیعہ علماء نے اور بھی بہت سے فقہی احکام بیان کیے ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف سے ان سب کو اس وقت نظر انداز کرتے ہوئے اس مسئلہ کے خلاصہ کے طور پر محترم

سید مرتضیٰ حسین صاحب کا "مدعا" ملاحظہ فرمالیں۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں۔

"ہمارا مقصد یہ ہے کہ حلّت متعہ بہ سند کتاب وسنّت ثابت ہے خواہ یہ جواز دائمی ہو یا پانچ دس سال کے لیے اور اس کے بعد حضرت عمرؓ کے حکم سے اس کو حرام مان لیا گیا۔ پھر شیعہ اذو نو اور روایات متاخرین کو بھی استناد قرار دے لیا جائے تو ان روایات سے کتب صحاح اولیّن کی روایات اور سابقین اوّلین کے رجحانات بے اساس نہیں رہتے۔

اسی لیے کتب فقہ میں کسی نہ کسی طرح کا حکم جواز ملتا ہے۔"

۔ "ہم بحث ومناظرہ میں نہیں جانا چاہتے۔ البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ متعہ کو ایسے الفاظ سے یاد کرنا چاہیے بعض اہل سنت نے استعمال کیے ہیں۔ بہت افسوس ناک ہے۔ فنّی طور پر جو موضوع فقہ و تفسیر وحدیثِ مسلّم ہو اور مذہب اہل بیت اس کے جواز پر بالاتفاق باقی ہو اس کے بعد بدزبانی، احترام کتاب وسنت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد مولانا موصوف انتہائی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فقہا اہل سنّت اس کے عدم جواز کے قائل ہیں اور ان کا اس پر اتفاق درجہ بہ درجہ بڑھتا گیا ہے مگر اجماع کا دعویٰ کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ اصولیین اہل سنّت۔ وقت واحد میں امر واحد پر اہل حل وعقد کا اتفاق اجماع ہے۔" یہ صورت بعد عہد نبوی مدّت تک پیدا نہیں ہوئی۔ بعد عہد صحابہ بھی ائمہ اہل بیت اور اہل مکہ متفق نہیں ہوئے اور آج بھی اتفاق جمیع فقہاء امت نہیں ہے۔"

اس لیے متعہ کے مسئلہ پر انتہا پسندی کا رویّہ اختیار کرنا علماء دین کی شان کے خلاف ہے۔

خاتمۂ کلام

کتاب کے اختتام پر حجتہ الاسلام علامہ محمد حسین کاشف الغطاء صاحب کے یہ الفاظ میرے حوالے سے ایک بار پھر ذہن نشین کرلیں کہ "یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ نہ تو مجھے شیعوں کی طرف سے دفاع کرنا مقصود ہے" اور نہ بحث وتکرار میں الجھنا چاہتا ہوں بلکہ مدعا یہ ہے کہ ہم نے آپس میں دوری اختیار کر کے ہمیشہ غلط فہمیوں کو پروان چڑھایا ہے۔ عدم معلومات نے ہمارے اندر باہمی طور پر نفرت اور حقارت پیدا کی ہے۔ اب ہم فاصلے کم کر کے علم کی روشنی میں آئیں اور حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔

اس لیے کہ بقول علامہ مرتضیٰ مطہری شہیدؒ کہ "یہ بزرگ سمجھ بیٹھے تھے کہ یورپ سے ہندوستان تک یہ جو شور مچا ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایران اور مصر کے کتب خانے جلوائے تھے اور جس پر کتابیں اور افسانے لکھے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ مفروضہ قطعی طور پر منوانے کے لیے کتب منطق وفلسفہ اور امتحانی سوالات میں ٹھونسا جارہا ہے شاید حضرت عمرؓ یا حضرت عمرو بن عاصؓ کے خلاف جذبات کی ترجمانی ہے یا فریب حق اہل تشیع کی خدمت اور امیرالمومنین علیؓ کے مخالفوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ سب کچھ ہورہا ہے۔"

"ہمارے ایسے خوش فہم بزرگ نہیں جانتے کہ جس فضا میں یہ مسائل اٹھائے جاتے ہیں۔ وہاں اسلام کا سوال آتا ہے۔ یہ سادہ لوح بزرگ نہیں سمجھتے کہ آج کسی دین اور اس کے آئین کے خلاف موثر ہتھیار کلامی بحثیں اور ذہنی منطق کے استدلال نہیں ہیں بلکہ اس دین کے پیروکاروں کا تاریخ کے دھارے

میں تمدّنی اور تہذیبی مظاہر کے ساتھ رویّہ موافق یا مخالف موثر ترین ہتھیار ثابت ہوتا ہے۔"

ان گرانقدر الفاظ اور پاکیزہ جذبات پر میں ایک بار پھر عرض کرتا ہوں کہ ایران کے اسلامی قائدین میں سے ایک شیعہ عالم کا خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں یہ اظہار کیا ہمیں یہ سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتا کہ اسلام اور اسلامی شریعت کے وسیع تر مفاد میں اب ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم بھی کلامی بحثوں اور منطقی استدلال سے آگے بڑھ کر افہام و تفہیم سے کام لیں اور سنجیدگی سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔

انھیں جذبات اور احساسات کے ساتھ میں نے چند شیعی اختلافی مسائل پر اُن کے اپنے مصادر کے حوالے سے مختصر سی گفتگو کی ہے۔ تاکہ حقائق سامنے آئیں اور غلط فہمیاں دور ہوں۔

اللہ ہماری مدد فرمائے۔

Acc No. 18070 Date 20/3/12
Section مناظرہ Status
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صیہونی سازش ہے۔ میرے نزدیک شیعہ اور زیدیہ چاروں مذاہب کی طرح اسلامی مذاہب ہیں۔ شیعہ سنّی صاحبان عقل اور ان دونوں کے سربراہوں پر واجب ہے کہ وہ ایک جگہ مل بیٹھیں اور آپس میں مفاہمت کریں۔ چاروں مذاہب اور شیعہ حضرات آپس میں تعاون کریں۔ اسی طرح ابن حزم کے مذہب ظاہر کی سے بھی تعاون کریں۔ میں دعوت دیتی ہوں کہ ائمہ اسلام خواہ وہ کسی بھی مذہب کے ہوں مل بیٹھیں تاکہ صیہونی سازشوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔"

("مجلہ "العالم" لندن شمارہ مارچ ۱۹۸۷ء

از: مجاھدہ زینب الغزالی")

محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا ۔

"ایران کے سفر میں ہم نے جس چیز کا مشاہدہ کیا اور اس نے ہماری مسرت میں اضافہ کیا۔ وہ ایرانیوں کا جذبۂ اخوت اور عالمگیر اسلامی اتحاد و تعاون کا جذبہ ہے جو وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر متفق ہو کر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم صفائی سے اعتراف کرتے ہیں کہ ۔ یہاں آنے سے پہلے اتحاد و تعاون کے اس جذبہ اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ دوستی اور تعاون اور بھائی چارہ اور اپنائیت کے اس احساس کا تصوّر تک نہیں کرتے تھے۔ ہمیں اس بات کی توقع نہیں تھی کہ ہمارے ایرانی بھائی اس عالمگیر لادینیت کے خلاف متحد ہو کر صف آرائی کی خواہش رکھتے ہیں جو مذاہب عالم اور تمام اخلاقی اقدار کے لیے چیلنج ہے اور جو شیعہ، سنّی، حنفی، شافعی اور مقلد و مجتہد کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتی۔ ایران میں ہر مجلس کی گفتگو کا آغاز اکثر اسی موضوع سے ہوتا اور اسی پر اختتام بھی۔ مجلسوں اور محفلوں میں عام طور سے یہی موضوع سخن ہوتا بلاشبہ یہ بہت مبارک اور قابل قدر جذبہ ہے، عالمگیر اخوت اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ ہمارے ایرانی بھائیوں کے ان جذبات سے فائدہ اُٹھائیں اور اسلام کی خدمت میں ان سے کام لیں اور اس میں مزید ترقی کی کوشش کریں ۔ اس لیے کہ افتراق اور غلو سے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً شدید نقصان پہنچا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں اس اختلاف کی شدّت نے تاریخ کے سب سے بڑے سانحہ سقوط بغداد کو جنم دیا۔ اسی اختلاف اور غلو پسندی نے مسلمانوں کو یورپ فتح کرنے اور اس کی آخری حدود تک جانے میں رکاوٹ ڈالی۔ اسی کے نتیجے میں ہندوستان میں پہلے حکومت کمزور ہوئی۔ پھر آخر میں اس کا چراغ ہی گل ہو گیا۔"

("دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" صفحہ ۹۷)